بسنت اور ثقافتی لبرل ازم

(محمد عطاء اللہ صدیقی)

ثقافت اور کلچر کی تعریف میں کہا گیا ہے کہ وہ زندگی کی روحانی، فکری، مذہبی اور اخلاقی قدروں کی مجسم تصویر کا نام ہے۔ سچائی، حسن، خیر محض، انصاف اور محبت اِسی کلچر کی کرنیں ہیں۔ ثقافت نام ہے ایک طرزِ فکر، تخلیقی روایت اور طرزِ معاشرت کا، جس میں زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ راست بازی، نگاہ کی بلندی اور کردار کی پاکیزگی قرار پاتی ہے۔

دنیا کے بڑے بڑے فلسفیوں، پیغمبروں اور دانشوروں کا کہنا ہے کہ بلند قدروں کا بنیادی سرچشمہ خدا کی ذات ہے جو تمام چیزوں کا پیمانہ ہے: God is the measure of all things اس کی وجہ یہ ہے اگر آدمی کا رشتہ خدا سے ٹوٹ جائے تو پھر وہ تخیل کی دنیا میں پرواز کرتا ہوا حقائق اور انسانیت سے تغافل بھی برت سکتا ہے۔

انیسویں صدی کے معروف انگریز شاعر اور فلسفی میتھو آرنلڈ نے ثقافت کے فکری پہلو کو اُجاگر کرتے ہوئے کہا تھا: " Culture is the creation of the best minds"

یعنی "ثقافت بہترین اذہان کی تخلیق کا نام ہے۔"

پروفیسر کرار حسین لکھتے ہیں:

"کلچر ایک ملغوبہ ہے، مذہب + ہسٹری + جغرافیہ کا۔ ہندوؤں کے کلچر اور ہمارے کلچر میں صرف جغرافیہ دونوں طرف ہے۔ ہسٹری اور مذہب ہمیں جدا کرتے ہیں۔"

معروف جرمن مؤرخ و فلسفی اسوالڈ سپنگلر کا کہنا ہے کہ

"ثقافت (کلچر) مافوق الطبیعات اَفکار پر یقین رکھنے کا نام ہے جن کے لئے انسان اپنی جان بھی دے سکتا ہے۔"

نامور مصری ادیب ڈاکٹر طٰہٰ حسین کے بقول:

"کلچر یا ادب ایک بلند قدر ہے جو کسی نظریہ کی آلہ کار نہیں بنتی۔"

ڈاکٹر رشید جالندھری صاحب کا یہ کہنا بھی درست ہے کہ

"کلچر کا تعلق اپنی سرزمین، مقامی رہن سہن، رسم ورواج اور زبان و ادب سے بھی ہوتا ہے۔"

جو لوگ کلچر کو محض رقص و سرود تک محدود سمجھتے ہیں اور جن کا تخیل کلچر کے متعلق طوائف کے کوٹھے کے حدود اربعہ کے باہر سوچنے سے قاصر ہے، ان کے لئے کلچر کا مندرجہ بالا سطور میں پیش کردہ تصور شاید قابل فہم نہ ہو۔ ایسے افراد جو ہر طرح کے لہو ولعب اور خرافات کو قومی کلچر بنا کر پیش کرتے ہیں، ممکن ہے ان کے اَذہان بھی کلچر کے اس ارفع تصور کو قبول کرنے میں تامل محسوس کریں، مگر حقیقت یہ ہے کہ کلچر کا حقیقی تصور یہی ہے جس کا خلاصہ اس مضمون کی تمہید کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ تہوار ایک ایسا موقع ہے جو کسی خاص حوالہ کے ساتھ کسی مذہب کے پیروکار اپنے کیلنڈر کے مطابق ہر سال مناتے ہیں۔ یہ حوالہ کسی تاریخی واقعہ کی یاد میں ہو سکتا ہے، اور کوئی مذہبی فریضہ اس کی شکل میں ممکن ہو سکتا ہے، لیکن ایک حقیقت جو کہ ہر جگہ درست نظر آئے گی وہ یہ ہے کہ تہوار ایک تاریخی عمل کی حیثیت سے مذہب اور مذہب کے پیروکاروں کے لیے یگانگت اور مذہبی وحدت کی بہت عظیم بنیاد ہے اور تاریخی طور پر ہمیشہ زندہ رہنے والی مثال ہے۔ عمومی طور پر مذہب سے منسلک تہوار معاشرتی رنگ میں ڈوب کر بھی واضح رہتے ہیں۔ تہوار منانے کے طریقے مختلف اقوام میں مختلف ہوتے ہیں۔ ہندوؤں میں تہوار منانے کے خاص طریقے ہیں۔ ہندوؤں کے تہواروں کے نام تو وہی ہیں لیکن ان کے طریقے بدل گئے ہیں۔ بعض تہواروں کے منانے کے طریقے میں برائے نام فرق کر دیا گیا ہے اور بعض کو مذہبی اُمور میں بہ تغیر نام شامل کر دیا گیا ہے۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں:

" تہوار منانے کے طریقے دنیا کی مختلف قوموں میں بے شمار ہیں۔ کچھ میں صرف کھیل کود اور راگ رنگ اور لطف و تفریح تک ہی تہوار محدود رہتا ہے۔ کہیں تفریحات تہذیب کی حد سے گزر کر فسق وفجور اور ناشائستگی کی حد تک پہنچ جاتی ہیں۔ کہیں مہذب تفریحات کے ساتھ کچھ سنجیدہ مراسم بھی ادا کیے جاتے ہیں۔ اور کہیں ان اجتماعی تقریبات سے فائدہ اُٹھا کر لوگوں میں اعلیٰ درجہ کی روح پھونکنے اور کسی بلند نصب العین کے ساتھ محبت اور گرویدگی پیدا

کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ غرض ہر ایک قوم کا تہوار منانے کا طریقہ گویا ایک پیمانہ ہے جس سے آپ اس کے مزاج اور اس کے حوصلوں اور اُمنگوں کو اعلانیہ ناپ کر دیکھ سکتے ہیں۔ جتنی بلند روح کسی قوم میں ہو گی، اتنے ہی اس کے تہوار اخلاقی اعتبار سے مہذب اور پاکیزہ ہوں گے۔ اس طرح اخلاقی اعتبار سے کوئی قوم جتنی پست ہو گی وہ اپنے تہواروں میں اتنے ہی مکروہ مناظر پیش کرے گی۔"

اسلامی تہوار ایک عجیب ثقافت، شان، شائستگی اور اخلاقی بلندی کے حامل ہوتے ہیں۔ اس میں نہ لہو و لعب ہوتا ہے، نہ گھٹیا تفریحات۔ ان کا بنیادی نصب العین ملتِ اسلامیہ میں اتحاد، بھائی چارہ، محبت اور یگانگی پیدا کرنا اور پاکیزہ اطوار دینا ہے۔

بسنت اور آزادروی

ہمارے ہاں دانشوروں کا ایک مخصوص طبقہ بسنت کو 'ثقافتی تہوار' کا نام دیتا ہے۔ مگر گذشتہ چند برسوں سے 'بسنت' کے نام پر جو کچھ کیا جارہا ہے، اسے زندگی کی روحانی، فکری اور اخلاقی قدروں کی مجسم تصویر نہیں بلکہ 'تذلیل' کہاجانا چاہئے۔

بسنت کے موقع پر جس طرح کی 'ثقافت' کا بھرپور مظاہرہ کیا جاتا ہے، کوئی بھی سلیم الطبع انسان اسے 'بہترین اذہان کی تخلیق' نہیں کہہ سکتا۔

بسنت ایک ایسے طرزِ معاشرت کو پروان چڑھانے کا باعث بن رہا ہے جس میں کردار کی پاکیزگی کی بجائے لہو و لعب سے شغف، اوباشی اور بے حیائی کا عنصر بے حد نمایاں ہے۔

گذشتہ چند برسوں سے بسنت کو زبردستی لاہور کے ایک ثقافتی تہوار کا درجہ دے دیا گیا ہے۔ تاریخی طور پر بسنت ایک ہندووانہ تہوار ہی تھا مگر جو رنگ رلیاں، ہلڑبازی، ہاؤہو، لچرپن، بے ہودگی، ہوسناکی، نمود و نمائش اور مادّہ پرستانہ صارفیت بسنت کے نام نہاد تہوار میں شامل کر دی گئی ہے، اس کا تاریخ سے کوئی تعلق ہے، نہ اہل پاکستان کی ثقافت اسے کبھی گوارا کر سکتی ہے۔ یہ بالکل نئی شروعات ہیں جنہیں تفریح و ثقافت کے نام پر پاکستان میں متعارف کرایا جارہا ہے۔ لاہوری بسنت کا اہم ترین مظاہرہ 'بسنت نائٹ' کو دیکھنے میں آتا ہے۔ بسنت نائٹ جسے 'شبِ عشرت' کہنا زیادہ مناسب ہے، پندرہ بیس سال پہلے اس کا وجود تک نہ تھا اور آج اس کے بغیر شاید بسنت کا سارا فیسٹیول 'پھیکا اور بے مزہ' نظر آئے۔

بسنتی تماش بینوں کے لئے 'بسنت نائٹ' ہی سب سے پر کشش اور ان کی ہوسنا کی کی تسکین کا موثر ترین ذریعہ ہے۔ ۲۰۰۰ء سے سرکاری سرپرستی نے اس ہوش ربا شبِ عشرت کے رنگِ حنا کو اور بھی چمکا دیا ہے۔ بسنتی پروانے شبِ بسنت کو تابناک شمع سمجھ کر اس پر ایسے جھپٹتے ہیں کہ اہالیانِ لاہور کی زندگیاں اجیرن بنا دیتے ہیں۔ لاہور کی سڑکوں پر ٹریفک کا اتنا بڑا اژدہام کبھی نظر نہیں آتا۔ دور و دراز سے بسنتی پروانے شبِ بسنت کی بھیگی منور زلفوں کے معمولی لمس کی حسرت دلوں میں لئے دیوانہ وار لاہور پر ٹوٹ پڑتے ہیں، اندرونِ لاہور ہوٹلوں، بڑے پلازوں اور بعض زندہ دلانِ لاہور کے مکانات کی چھتیں بسنت نائٹ کو طوائف کے کوٹھے اور انگریز دور کے جمخانہ جیسے میکدے سے زیادہ بارونق نظر آتے ہیں۔

بسنت نائٹ کو بازاری عورتیں جسم فروشی سے چاندی بناتی ہیں تو لاہور ہے ملٹی نیشنل کمپنیوں اور بڑے تاجروں کو اپنے مکانات کی چھتیں کرائے پر دے کر ایک ہی رات میں لاکھوں کی کمائی کرتے ہیں۔ کئی کئی ہفتے پہلے ان چھتوں کے سودے ہو جاتے ہیں۔ اندرونِ لاہور کی چھتیں بسنت نائٹ منانے کے لئے پچاس ہزار سے لے کر ۱۰ لاکھ تک بک کی جاتی ہیں۔ ان چھتوں پر صرف لذتِ کام و دہن کا ہی اہتمام نہیں ہوتا، ذوقِ سماعت کے لئے راگ رنگ اور ہوسناک نگاہوں کی تسکین کا بھی پورا پورا خیال رکھا جاتا ہے۔ شراب و کباب، موسیقی، پری زاد چہرے، رقص، جلوے؛ غرض کیا کچھ نہیں ہوتا۔ بسنت نائٹ، شبِ غنا اور شبِ گناہ کا بہت ہی کریہہ منظر پیش کرتی ہے۔

لاہور شہر کے ہوٹلوں کی چھتیں ہی نہیں، کمرے بھی بسنتی ذوق کے مطابق آراستہ کئے جاتے ہیں۔ شام ڈھلتے ہی ان چھتوں پر راگ رنگ، ناؤ و نوش، موسیقی اور پتنگ بازی شروع ہو جاتی ہے۔ ایسی محفلوں میں شراب پانی کی طرح چلتی ہے۔ بسنت نائٹ پر ان ہوٹلوں میں کمروں کے نرخ چار پانچ گنا بڑھ جاتے ہیں۔ باذوق تماش بین ایسے ہوٹلوں میں اپنی چاہت کے کمروں میں قیام کے لئے لاکھوں روپے خرچ کرنے سے بھی پس و پیش نہیں کرتے۔ ان ہوٹلوں کی راہداریوں میں جا بجا نشے میں دھت جوڑے جھولتے لڑکھڑاتے نظر آتے ہیں۔ لاہور شہر میں جنسی بے راہ روی کتنی ہے، اور بازاری عورتوں کے لاؤ لشکر کس قدر زیادہ ہیں، اس کا اندازہ اگر کوئی کرنا چاہے تو بسنت نائٹ سے زیادہ موزوں شاید کوئی دوسرا موقع نہ ہو۔

بسنت اور ملٹی نیشنل کمپنیاں

بسنت کے موقع پر مال روڈ، جیل روڈ، گلبرگ بلیووارڈ، فیروز پور روڈ اور دیگر اہم شاہراتِ پتنگوں کی شکل کے بورڈوں اور اشتہارات سے مزین کر دی جاتی ہیں۔ ان شاہراہوں پر سفر کرنے والے کی نگاہیں ان پتنگوں سے چھٹکارا نہیں پا سکتی۔ ٹیلی ویژن اور اخبارات بھی ایسے اشتہارات اور بسنتی پروگراموں کو

بھرپور کوریج دیتے ہیں۔ پی ایچ اے اور دیگر سرکاری اداروں کے تعاون سے بڑے زبردست 'ثقافتی' پروگرام منعقد کئے جاتے ہیں۔ شاہی قلعہ، حمام، ریس کورس اور دیگر مقامات پر رنگارنگ تقریبات کی جاتی ہیں جن پر لاکھوں روپیہ خرچ کیا جاتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ سرکاری ادارے اپنے بجٹ سے یہ رقم خرچ نہیں کرتے بلکہ ملٹی نیشنل کمپنیاں اور کاروباری ادارے یہ پروگرام سپانسر کرتے ہیں۔ ۲۰۰۳ء میں بسنت کے موقع پر کوکا کولا نے ۴۵ لاکھ روپے اور پیپسی کولا نے ۳۵ لاکھ روپے کی خطیر رقم اس طرح کے پروگرام اور شاہراہوں کو سجانے کے لئے عطیات کے طور پر دی۔ یہ وہ اعداد و شمار ہیں جو پی ایچ اے نے صوبائی اسمبلی کے ایک معزز رکن کے سوال کے جواب میں دیئے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کثیر القومی تجارتی ادارے پاکستان کے ایک نام نہاد ثقافتی تہوار کی رونق کو دوبالا کرنے کے لئے اس قدر فیاضی اور سخاوت کا مظاہرہ کیوں کرتے ہیں؟ اس کا سیدھا سادا جواب یہ ہے کہ انہیں ہماری ثقافت سے کوئی دلچسپی نہیں، درحقیقت وہ ایک ایسی ثقافت کو فروغ دینا چاہتے ہیں جو اُن کی تجارت کو پروان چڑھا سکے۔

مغربی سرمایہ دارانہ نظام کے اُصولوں کو فروغ دینے والی یہ کمپنیاں تجارت کے ساتھ ساتھ ثقافتی لبرل ازم کا ایجنڈا بھی رکھتی ہیں۔ ان کا کاروبار مغربی کلچر کو پروان چڑھائے بغیر فروغ نہیں پا سکتا۔ یورپ اور امریکہ میں ان یہودی تاجر اداروں نے پہلے ایک مخصوص لبرل کلچر کو ترقی دی، بعد میں اس موزوں کلچر کی وجہ سے ان کا کاروبار خوب چمکا۔ آج صورت یہ ہے کہ امریکہ میں پیاس بجھانے کے لئے شاید ہی کوئی امریکی سادہ پانی کا گلاس پئے۔ کوکا کولا اور اس طرح کے مشروب ہی ان کے لئے پانی کی جگہ لے چکے ہیں۔ پاکستان میں بھی حالیہ برسوں میں ان مغربی مشروبات کی کھپت میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔

مغربی سرمایہ دارانہ نظام نے جس صارفیت کو جنم دیا ہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ لوگوں کو خاندانی ماحول سے نکال کر بازار اور منڈی کے مخلوط ماحول میں لا کھڑا کیا جائے جس میں لہو و لعب، فارغ البالی اور جنسی بے راہ روی کو بنیادی حیثیت حاصل ہو۔ امریکی تھنک ٹینک ان ملٹی نیشنل اداروں کو ثقافتی ایجنڈا بھی سونپتے ہیں۔ ترقی پذیر ممالک کے کلچر کو مغربی کلچر کے مطابق ڈھالنا ان کے اس ایجنڈے کا اہم نکتہ ہے۔ پاکستان میں میکڈونلڈ نقصان میں جا رہا ہے، مگر وہ اپنے کسی بھی سیل پوائنٹ کو بند نہیں کر رہے۔ امریکہ سے آنے والے ایک باخبر پاکستانی کا کہنا ہے کہ میکڈونلڈ نے پاکستان میں اپنے ریستوران کا جال بچھا کر امریکہ میں اچھی خاصی subsidy (امداد) حاصل کی ہے۔

ان کا ثقافتی ایجنڈا یہ ہے کہ پاکستانیوں کو مشرقی کھانوں سے بیزار کر کے امریکی کھانوں کی رغبت دی جائے۔ امریکہ دنیا میں سیاسی نظام کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ اپنی ثقافتی اقدار کو بھی مسلط کرنا چاہتا ہے۔ مگر افسوس ہمارے پالیسی ساز اس خطرناک ایجنڈے کا اِدراک کرنے سے قاصر ہیں۔ وہ محض اس بات پر ہی خوش ہیں کہ انہیں بسنت منانے کے لئے ملٹی نیشنل کمپنیاں کروڑوں روپے دے رہی ہیں اور ان کی جیب سے کچھ خرچ نہیں ہو رہا۔ ان سکوں کی جھنکار میں

پاکستان پر غیر محسوس طریقے سے جو ثقافتی یلغار کی جا رہی ہے، اس کے خطرناک مضمرات سے چشم پوشی بے حد افسوسناک ہے۔ ملٹی نیشنل کمپنیاں بسنتی تہوار کے ذریعے کس طرح کا کلچر پروان چڑھانا چاہتی ہیں، اس کا اندازہ ان کی طرف سے دیئے گئے اشتہارات اور جابجا نصب کردہ بسنتی بورڈوں پر درج شدہ ان نعروں سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

۲۰۰۳ء کے بسنت کے موقع پر پیپسی کولا نے اپنے بورڈوں پر یہ نعرہ درج کیا:

سارے لہور دی اِکوٹور پیپسی گڈیاں، بھنگڑے ڈور

بسنت مناواں، پینگاں پاواں کھابے کھاواں، موج اڑاواں

ایک اور ملٹی نیشنل کمپنی نے کپڑے کے بسنتی بینروں سے لاہور شہر کو سجا رکھا تھا اس پر تحریر تھا:

ع رقص میں ہے سارا جہاں

یہ ملٹی نیشنل کمپنیاں پاکستان میں کھابے کھانے اور موج اُڑانے کا کلچر پروان چڑھا کر پاکستان کی نوجوان نسل کو اس کی فکری اَساس اور ان بلند ثقافتی قدروں سے محروم کرنا چاہتی ہیں جن کے بغیر کوئی بھی قوم ثقافتی عروج حاصل نہیں کر سکتی۔ ان بلند ثقافتی اقدار کا ذکر اس مضمون کی تمہید میں کر دیا گیا ہے، قارئین خود ہی موازنہ کر لیں۔

بسنت پر انسانی جانوں کا زیاں

بسنت کے پردے میں پاکستان میں رقص و سرود، لہو و لعب اور بے حیائی کو فروغ دینے کے لئے ملٹی نیشنل کمپنیاں بھاری سرمایہ کاری کر رہی ہیں۔ بسنتی لہو و لعب کے بڑھتے ہوئے رجحان سے جہاں ہماری ثقافتی اقدار کا جنازہ نکل رہا ہے، وہاں قاتل بسنت کے ہاتھوں اپنی جانیں ہار جانے والوں کے جنازے بھی سال بہ سال اُٹھ رہے ہیں۔ دھاتی ڈور سے شہ رگ کٹنے کے واقعات پڑھ کر کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ بسنت کے دنوں میں چھتوں سے گر کر اور گاڑیوں سے ٹکرا کر

مرنے اور زخمی ہونے والوں کا ذکر بھی کچھ کم روح فرسا نہیں ہے۔ کاش کہ فلڈ لائٹوں کی مصنوعی چکاچوند روشنی میں پتنگ بازی کا شغل برپا کرنے والوں کو احساس ہوتا کہ کتنے معصوم شہری موت کے اندھے غار میں اُتر جاتے ہیں۔

بسنت کے موقع پر کتنے لوگ ہلاک اور زخمی ہوتے ہیں، اس کا باقاعدہ ریکارڈ رکھنا تو بہت مشکل ہے۔ گزشتہ چند سالوں سے اخبارات میں دھاتی تار کی وجہ سے بجلی کا کرنٹ لگنے اور شہ رگ پر ڈور پھرنے کی وجہ سے ہونے والی ہلاکتوں کی خبریں شائع ہوئی ہیں، مگر بسنت کے موقع پر چھتوں سے گر کر، گاڑیوں سے ٹکرا کر اور دیگر وجوہات سے زخمی ہونے والوں کے حتمی اعداد و شمار کو جمع کرنا بے حد مشکل ہے۔ ۲۰/ فروری ۲۰۰۰ء کو روزنامہ انصاف نے ۱۹۹۵ء سے لیکر ۲۰۰۰ء تک بسنت کے دنوں میں ہلاک اور زخمی ہونے والوں کی تعداد کے بارے میں ایک رپورٹ شائع کی جس کے مطابق:

سال	ہلاکت	زخمی	سال	ہلاکت	زخمی
۱۹۹۵ء	6	۲۰۰	۱۹۹۸ء	6	۵۰۰
۱۹۹۶ء	۷ (۲ بچے)	۲۵۰	۱۹۹۹ء	۳	675
۱۹۹۷ء	۳	۸۰۰	۲۰۰۰ء	۸	۷۱۳

۲۰۰۳ء میں لاہور میں ۱۰ قیمتی جانیں بسنت کی 'خوشیوں' کی نذر ہوئیں۔ جبکہ ۳۰۰ سے زائد افراد زخمی ہو کر اور اندھی گولیوں کا نشانہ بن کر ہسپتالوں میں پہنچے۔ نوائے وقت کی خاتون مضمون نگار رفیعہ ناہید پاشا نے ۱۹/ جنوری ۲۰۰۴ء کو گذشتہ تین برسوں کے دوران پتنگ بازی کے باعث پیش آنے والے چند دلخراش واقعات کی رپورٹ پیش کی ہے۔ اسے پڑھ کر ایک حساس آدمی جذبات پر قابو نہیں رکھ سکتا۔ وہ لکھتی ہیں:

"۲ جولائی ۲۰۰۳ء کے صرف ایک ہفتے میں تین افراد قاتل ڈور کا شکار ہوئے۔ ۱۴ سالہ طالب علم ندیم حسین شام کو ٹیوشن پڑھ کر موٹر سائیکل پر گھر واپس آرہا تھا، اس کی گردن پر کٹی پتنگ کی ڈور پھر جانے سے اس کی شہ رگ کٹ گئی۔ اس سے پہلے کہ کوئی مدد کو آتا وہ کلمہ چوک کے قریب جان جانِ آفرین کے سپرد کر چکا تھا۔ لاش گھر پہنچی تو کہرام مچ گیا۔ وہ میٹرک کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا اور ماں بہنیں جنہوں نے اس کے تابناک مستقبل کے حوالے سے کئی خواب دیکھ رکھے تھے، اس کی کتابیں ہاتھ میں لئے بے بسی سے آنسو بہاتی رہیں، جوان بیٹوں کے لاشے وصول کرنا آسان نہیں ہوتا۔ ادھیڑ عمر ماں لاش سے لپٹ کر دیر تک روتی رہی۔

اسی طرح مکھن پورہ کا رہائشی مبین شاہد اپنی اہلیہ اور تین سالہ بیٹے فہیم کے ساتھ موٹر سائیکل پر سوار ہو کر سسرال جارہا تھا کہ اچانک مزنگ کے قریب فہیم خون میں لت پت ہو گیا۔ دونوں میاں بیوی وحشت سے چیخ وپکار کرنے لگے تو علم ہوا کہ ڈور بچے کی شہ رگ کاٹ چکی ہے۔ چند لمحوں کے اندر اندر فہیم نے باپ کی گود میں تڑپ تڑپ کر جان دے دی۔" (نوائے وقت)

معروف کالم نگار حسن نثار نے 'بسنتی قتل عام' کے عنوان سے تحریر کردہ کالم میں ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھا:

" ایک اور حادثہ کا میں جزوی طور پر عینی شاہد ہوں، میں نے کلمہ چوک کے قریب معصوم خون کا وہ بہت بڑا دھبہ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، جس کا تعلق ایک ایسے نوعمر لڑکے سے تھا جو کئی بہنوں کا اکلوتا بھائی ہونے کے ناطے پورے خاندان کی جان تھا اور یہ جان بھی بے رحم ڈور نے لے لی۔ اک اور گھر کا چراغ پتنگ بازی نے گل کر دیا۔" (جنگ: ۲ / جولائی ۲۰۰۳ء)

علیٰ ہذا القیاس پتنگ بازی کے ہاتھوں ہلاک ہونے والے کس کس کا نام لیا جائے۔ خود حکومتِ پنجاب نے حال ہی میں صوبائی اسمبلی میں ایک رکن اسمبلی کے سوال کے جواب میں جو رپورٹ دی ہے، اس کے الفاظ ملاحظہ کیجئے:

"پتنگ بازی کے نتیجہ میں لاہور شہر میں قیمتی جانوں کا ضیاع ہوا ہے۔ اعداد و شمار کے مطابق بسنت کے دوران صرف لاہور شہر میں ۴۲ / افراد ہلاک ہوئے جبکہ ۴۲۵ / افراد زخمی ہوئے۔ لیکن حکومتِ پنجاب کی طرف سے پتنگ بازی پر پابندی عائد کرنے کے بعد ان قیمتی جانوں کا ضیاع تقریباً ختم ہو گیا ہے۔ موٹر سائیکل سوار نوجوان گلے پر ڈور پھرنے کی وجہ سے جاں بحق ہوئے۔ لیکن حکومت کی طرف سے دھاتی تار اور کیمیکل ڈور پر پابندی لگنے کے بعد یہ اموات نہ ہونے کے برابر ہیں۔" (اسمبلی ریکارڈ)

یاد رہے کہ یہ جواب اسمبلی میں ۱۷ / اکتوبر ۲۰۰۳ء کو داخل کرایا گیا اور ۱۲ / جنوری ۲۰۰۴ء کو زیر بحث لایا گیا۔ ایک طرف رفیعہ ناہید پاشا کی طرف سے بیان کردہ دلخراش واقعات اور حکومتِ پنجاب کی رپورٹ ہے، مگر دوسری طرف ہمارے پیش نظر ایک صوبائی وزیر کا بیان ہے۔ مؤرخہ ۸ / جنوری ۲۰۰۴ء کو ایک مقامی ہوٹل میں بسنت فیسٹیول کے آرگنائزر کی طرف سے منعقدہ تقریب سے خطاب کرتے ہوئے انسانی جانوں کے حوالے سے فرمایا:

"اس سے کہیں زیادہ ہلاکتیں، ڈکیتیوں، ٹریفک حادثات اور خودکشیوں میں ہوتی ہیں، اس پر کوئی نہیں بولتا۔" (نوائے وقت)

مجھے یاد ہے کہ معروف کالم نگار جناب عطاء الحق قاسمی نے بھی ۲۰۰۱ء میں روزنامہ 'پاکستان' میں شائع ہونے والے اپنے ایک انٹرویو میں بسنت کے جواز میں کچھ اس طرح کا استدلال پیش کیا تھا، مگر ۲۰۰۳ء کے بسنت کے موقع پر انہوں نے برملا اعتراف کیا کہ بسنت جیسی عوامی تفریح کو مافیا نے اپنی عیاشی اور نمود و نمائش کا ذریعہ بنالیا۔ (کالم مؤرخہ ۱۷/ فروری ۲۰۰۳ء)

اگر غور کیا جائے تو ڈکیتیوں، ٹریفک حادثات اور خود کشیوں کے نتیجے میں ہونے والی ہلاکتوں اور پتنگ کی ڈور سے شہ رگ کٹ کر مرنے والوں میں ایک اُصولی فرق ہے۔ ٹریفک حادثات ہوں یا ڈکیتیاں، ان میں ذمہ دار افراد کو اسی وقت یا بعد میں گرفتار کیا جاسکتا ہے اور ان پر مقدمہ دائر ہو سکتا ہے۔ مگر لاہور جیسے گنجان آباد شہر میں گذشتہ تین سالوں میں ۴۲/ افراد پتنگ بازی کی وجہ سے لقمہ اجل بن چکے ہیں مگر آج تک کسی بھی 'قاتل ڈور' کے پس پشت ہاتھ پر ہاتھ نہیں ڈالا جاسکا، اور نہ ہی اس کا مستقبل میں کوئی امکان ہے۔

پھر ٹریفک اور پتنگ بازی ایک جیسے اہم نہیں ہیں۔ شہر میں ٹریفک تو ناگزیر ہے، مگر پتنگ بازی کے بغیر نہ صرف یہ کہ گذارا ہو سکتا ہے بلکہ گذشتہ چند ماہ کی پابندی کے دوران عوام نے بہت سکھ پایا ہے۔ پھر یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہئے کہ ٹریفک کے حادثات میں ہونے والی ہلاکتیں لاہور جیسے گنجان آبادی کے شہر میں نہیں ہوا کرتیں، یہ ہائی ویز پر تیز رفتاری سے ہوتی ہیں۔ شہر میں تیز رفتار ٹریفک کی اجازت نہیں ہے کیونکہ اس سے ہلاکتوں کا خدشہ رہتا ہے۔ اسی طرح اگر شہری آبادی میں پتنگ بازی سے ہلاکتوں کا خدشہ ہو تو اس پر پابندی ضرور لگنی چاہئے۔ ٹریفک حادثات اور بسنتی حادثات کو ایک ہی میزان میں تولنا غیر منطقی اور غیر عقلی استدلال ہے!!

لاہور کی نئی بسنت

۲۰۰۰ء سے لاہور میں بسنت منانے کے طور طریقوں، انداز و اطوار اور لہو و لعب کے اُسلوب میں نمایاں تبدیلی دیکھنے میں آئی ہے۔ یہ پہلا سال تھا جب پی ایچ اے اور دیگر سرکاری اداروں نے بسنتی پروگراموں کا نہ صرف بھرپور اہتمام کیا بلکہ ملٹی نیشنل اداروں اور تجارتی کمپنیوں کو بسنتی ثقافت کے فروغ میں والہانہ کردار ادا کرنے کی ترغیب دی گئی۔ بسنت مافیا نے سرکاری شرکت کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے بسنت میں ایسی ایسی خرافات بھی شامل کردیں جن کا 'سرسوں کے پھول کی خوشبو' یا عوام کی 'صاف ستھری' تفریح سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اس سے پہلے شہر کی عیاش اشرافیہ ناؤ و نوش اور رقص و سرود کی جو محفلیں کوٹھیوں اور حویلیوں کی چار دیواری میں برپا کرتی تھی، اب اس کا اہتمام ہوٹلوں، ریستورانوں، بلند و بالا عمارتوں اور بازاری پلازوں کی چھتوں پر بے حد

ہنگامہ خیز انداز میں کیا جانے لگا۔ اب تماش بینوں کو بسنتی مجرے دیکھنے یا بسنتی لباس میں گڈے اُڑاتی پری جمال تتلیوں کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے یوسف صلاح الدین جیسے 'شرفا' کی حویلیوں کے طواف کرنے کی ضرورت نہ رہی۔ اب تو ہر دوسرے ہوٹل یا پلازے کی چھتیں مجرہ گاہ کا منظر پیش کرنے لگیں۔ سینکڑوں نہیں، بلکہ ہزاروں نو دولتیوں نے بسنت کو 'طوائف' سمجھ کر اس پر اپنے سرمائے کی یلغار کر دی۔ پھر ان لوگوں نے ان چھتوں پر جو اں جسموں کی وہ وہ منڈیاں لگائیں کہ یوسف صلاح الدین جیسے روایتی بسنت کے عاشق شرفا بھی اس کو دیکھ کر شاید شرما جائیں۔

اس تبدیلی کو نذیر ناجی جیسے سیکولر کالم نگار نے بھی محسوس کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"بسنت ہر سال نئے زور اور نئی توانائیوں کے ساتھ آنے لگی ہے اور مجھے ہر بار یوسف صلاح الدین یاد آتے ہیں۔ لاہور بلکہ پاکستان میں بسنت کو نئے دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے اور اسے گلی محلوں کے تہوار سے اوپر اٹھا کر پاکستان کی اشرافیہ اور پھر عالمی سطح تک لانے میں یوسف صلاح الدین نے پہلا اور بنیادی کردار ادا کیا۔ اُنہی کی دعوتوں پر لاہور کے ایلیٹ نے بسنت منانا شروع کی... اور پھر تہوار کے پھیلتے رنگ چاروں طرف چھا گئے۔ یوسف صلاح الدین آج بھی اپنی حویلی میں بسنت مناتے ہیں لیکن سرمائے کی یلغار نے انہیں بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے۔" (روزنامہ جنگ: ۱۲/ فروری ۲۰۰۳ء)

نذیر ناجی جیسے دانشور تو شاید بسنت کے پھیلتے رنگوں کے سحر سے باہر آنے کو تیار نہیں مگر یہی وہ 'نئے دور کا بسنت' ہے جس نے پاکستان کی ثقافتی قدروں کو شدید خطرات سے دوچار کر دیا ہے اور جس کی وجہ سے ہر اس پاکستانی کا چین غارت ہو گیا ہے جو اس ملک کی نظریاتی سرحدوں کو یوں نیست و نابود ہوتے دیکھ کر خون کے آنسو روتا ہے۔

بسنت کا 'نیا زور' اور 'نئی توانیاں' دیوانہ وار آگے بڑھتی رہیں۔ بالآخر ۲۰۰۲ء میں یہ ہنگامہ کلائمکس (Climax) کو چھوتا دکھائی دیا۔ اس سال بسنت کے نام پر وہ ہڑبونگ مچا جس کی ماضی میں نظیر نہیں ملتی۔ پہلے بسنت صرف ایک دن منائی جاتی تھی، اس سال تین دن تک یہ شور شرابہ جاری رہا۔ بسنت مافیا نے نئی خرافات متعارف کرائیں۔ نئے نئے بے ہودہ بسنتی گیتوں سے محلے اور بازار گونجنے لگے۔ Tango نام کی ایک تجارتی کمپنی نے شہر میں جا بجا ٹرالر کھڑے کئے جن پر کرائے کے لڑکے اور لڑکیاں 'نچ پنجابن نچ' جیسے بیہودہ گیت پر مجنونانہ ڈانس کرتے۔ ماڈل ٹاؤن، خالد مارکیٹ میں اس کمپنی کا ٹرک مسجد سے محض ۲۰ فٹ کے فاصلہ پر کھڑا کیا گیا۔ اذان اور نماز کے وقت بھی یہ لوگ 'نچ پنجابن نچ' کی مستی میں مبتلا رہے۔ متعدد سپیکروں کی کان پھاڑنے والی آواز، بے ہودہ گانوں اور لچر ڈانس سے مقامی آبادی کو اس قدر پریشانی کا سامنا کرنا پڑا کہ شہریوں نے اشتعال میں آکر اس ٹرالر پر حملہ بول دیا اور اسے زبردستی بند کرایا۔ یہ تو

محض ایک مثال ہے ورنہ شہر بھر میں بیہودگی اور لچرپن کا راج تھا۔ یوں لگتا تھا کہ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت پاکستان کی ثقافت کی جڑیں اکھاڑنے اور مغرب کی بیہودہ لبرل تہذیب کو رواج دینے کا پروگرام بنایا گیا ہے اور اس مقصد کے حصول کے لئے بسنت کو ایک Cover کے طور پر استعمال کیا جارہا ہے۔

۲۰۰۲ء میں ۱۷/ فروری کو لاہور میں بسنت منائی گئی۔ اس سال سب سے زیادہ Vulgur (بے ہودہ) تقریب کا اہتمام ایک این جی او نے شاہی قلعہ میں کیا۔ قومی اخبارات نے اس تقریب کی جو تفصیلات شائع کیں، اسے پڑھ کر ہر شخص بخوبی اندازہ کر سکتا ہے کہ ہمارے ہاں بسنت کے نام پر کس طرح کا کلچر پروان چڑھانے کی کاوش کی جارہی ہے۔ روزنامہ پاکستان نے ۱۹/ فروری ۲۰۰۲ء کو اس واقعہ کی خبر صفحۂ اوّل پر شائع کی۔ اس خبر کی نمایاں سرخی یہ تھی:

"شاہی قلعہ میں کھلم کھلا شراب چلی..."

مزید تفصیلات ملاحظہ فرمائیے:

"لیٹن رحمت اللہ آئی ہسپتال کے زیر اہتمام شاہی قلعہ لاہور میں عطیات اکٹھے کرنے کے لئے بڑی تقریب کا اہتمام کیا گیا جہاں سر عام شراب تقسیم کی گئی۔ روزنامہ پاکستان کی تحقیق کے مطابق ایل آر بی ٹی (لیٹن رحمت اللہ بینوولینٹ ٹرسٹ) کے زیر اہتمام جمعہ کو شاہی قلعہ میں تقریب منعقد ہوئی اور اس پروگرام کے دعوتی کارڈ چھ ہزار روپے فی کس کے حساب سے فروخت کئے گئے۔ اس تقریب میں وفاقی وزیر پٹرولیم عثمان امین الدین مہمانِ خصوصی تھے۔ شاہی قلعہ کے وسیع باغ میں رات دیر گئے تک جاری رہنے والی اس تقریب میں سینکڑوں 'مخیر' حضرات نے شرکت کی۔ کھانے کے ہر میز پر ۲/ افراد کی گنجائش تھی۔ جبکہ ہر میز کے ساتھ وافر مقدار میں شراب سجائی گئی تھی۔ شرکا تقریب میں موسیقی کے پروگرام کے ساتھ شراب نوشی سے بھی لطف اندوز ہوتے رہے۔"

روزنامہ پاکستان کی اس تحقیقاتی رپورٹ کے یہ الفاظ غور سے پڑھنے کے لائق ہیں:

"اس پارٹی میں ایک اعلیٰ سرکاری عہدیدار نے غیر ملکی مہمانوں کو فخر سے دکھاتے ہوئے کہا کہ آپ خود دیکھ لیں: کہاں ہے بنیاد پرستی اور انتہاپسندی؟ پاکستان ایک لبرل اور اعتدال پسند معاشرہ ہے...!!"

روزنامہ پاکستان نے اسی روز مولانا عبدالرحمن اشرفی، مفتی غلام سرور قادری، مولانا سمیع الحق، منور حسن، مولانا امجد خان اور دیگر تقریباً ۲۰ علماء کے نام بھی شائع کئے جنہوں نے اس پروگرام کے ذمہ داران کی شدید مذمت کی اور کہا کہ شراب کو خیرات کا ذریعہ بنانا جائز نہیں۔

ضلعی ناظم میاں عامر محمود نے بیان دیا کہ

"اگر ایسا پروگرام ہوا ہے تو متعلقہ افراد کے خلاف کارروائی کی جائے گی، انہوں نے کہا جو کچھ ہوا میرے علم میں نہیں۔ اگر اس تقریب میں سرعام شراب تقسیم کی گئی ہے تو متعلقہ افراد کے خلاف تحقیق کر کے کارروائی کی جائے گی۔ انہوں نے کہا کہ خیرات کے نام پر شراب کی محفلیں منعقد کرنا غیر قانونی اقدام ہے۔" (روزنامہ پاکستان: ۱۹ / فروری ۲۰۰۲ء)

بعد میں اس واقعہ کے متعلق کوئی تحقیق یا کسی کے خلاف کوئی کارروائی ہوئی؟ اس کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں ہے۔

روزنامہ نوائے وقت نے ۱۹ / فروری ۲۰۰۲ء کے اداریے میں بسنتی خرافات کا نوٹس لیتے ہوئے تحریر کیا:

"اس پر مستزاد یہ کہ شاہی قلعہ لاہور کی تقریب میں شراب وافر مقدار میں تقسیم کی گئی اور ۲ / افراد کی ہر میز کے ساتھ شراب سجائی گئی تھی۔ ان سب حقائق کے پیش نظر یہ کہنا مناسب ہے کہ تعیش پسند طبقے نے مال خوب لٹایا اور حکومتی پابندیاں پتنگوں کے ساتھ اُڑادیں یا ناؤ و نوش کی نذر کر دیں۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ ان تقریبات میں غیر ملکی سفیروں کو بلا کر پاکستان کی عشرت پسندی کا ایسا مظاہرہ کیا گیا جو ملک و قوم کی تہذیبی روایات کے خلاف تھا۔ جرمنی کے سفیر نے کہا کہ "ہمارے ملک میں بھی پتنگ بازی ہوتی ہے مگر پاکستان میں انوکھی ہے۔"

چین پتنگ بازی کو رائج کرنے والا ملک شمار ہوتا ہے لیکن جو عیاشی لاہور میں دیکھی گئی اس کا متحمل چین جیسا ملک بھی نہیں ہے... بسنت ہندوؤں کا تہوار ہے لیکن بھارت میں بسنت عام معمول کا دن تھا۔ پاکستانیوں نے اسے 'ہائی جیک' کر کے لہو و لعب کے فروغ کا وسیلہ بنایا۔ اخبارات میں خواتین کے بھنگڑے کی جو تصویریں چھپیں، غیرت کے منافی ہیں۔ یہ قوم کش عیاشی اس طبقے کی ہے جس نے حرام مال افراط سے جمع کیا ہے اور اب اس حال مست قوم کا تہذیبی مزاج لبرل ازم کی طرف لانے کے لئے برسرِ عمل ہے۔ امریکہ جس لبرل ازم کو فروغ دینا چاہتا ہے وہ پورے ڈھول ڈھمکے کے ساتھ یہاں وارد ہو چکی ہے۔ اور اس کو سرکاری سرپرستی بھی حاصل ہے۔"

ایک سال بعد نوائے وقت کے احتجاجی نوٹ میں مزید تلخی پیدا ہو گئی:

"پچھلی تین بسنتوں کے دوران لاہور جیسے علمی و تہذیبی شہر کا جو حال ہوا وہ بیان سے باہر ہے۔ شراب کے جام پر جام لنڈھائے گئے۔ حکمرانوں کی موجودگی میں مقامی اور دوسرے شہروں سے آئے ہوئے 'معززین' نے وہ حرکات کیں کہ ان کے ذکر سے بھی تعفن محسوس ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ خالد حسن جیسا لبرل اور سیکولر خیالات رکھنے والا دانشور انگریزی روزنامے ڈان میں یہ لکھنے پر مجبور ہو گیا کہ بسنت کے روز لاہور 'کوٹھے' میں تبدیل ہو چکا تھا۔"

(ادارتی نوٹ: ۳/جولائی ۲۰۰۳ء)

لبرل کلچر کی ایک جھلک

حالیہ برسوں میں بسنت کے جنون نے ہمارے معاشرے کی صدیوں سے مسلمہ سماجی و ثقافتی اقدار کو شکست و ریخت سے دوچار کر دیا ہے۔ ہمارے معاشرے میں عورتیں پتنگ بازی کے شغل میں شریک نہیں ہوتی تھیں۔ عورتوں اور لڑکوں کا چھت پر جا کر پتنگ کی ڈور پکڑنا یا 'بوکاٹا' کے نعروں میں شامل ہونا بے حد نازیبا اور گری ہوئی حرکت سمجھی جاتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ چھتوں پر مرد یا جوان لڑکے ہی پتنگ بازی کا شغل برپا کرتے دکھائی دیتے تھے۔ عام آدمی کی غیرت گوارا نہیں کرتی تھی کہ وہ اپنی بیوی، بیٹی یا بہن کو اس لہو و لعب میں شانہ بشانہ شریک دیکھ سکے۔ مگر اب تو معلوم ہوتا ہے کہ شرم و حیا کے تمام پردے گرا دیے گئے ہیں۔ چھتوں پر عورتیں بسنتی لباس پہن کر نہ صرف سرسوں کی فصلیں لگاتی ہیں بلکہ باپ، بھائی اور غیر محرم مردوں کی موجودگی میں 'بوکاٹا' کے نعرے لگاتی ہیں، پتنگ باز سجنا کے گیت گاتی ہیں، اور ترنگ میں آکر بھنگڑا بھی ڈال لیتی ہیں۔

بسنت کے موقع پر قریبی چھتوں پر لڑکے اور لڑکیوں کے غول در غول عشق و فسق کی آتش کو ہوا دینے میں بے حد سازگار ماحول مہیا کرتے ہیں۔ اس لبرل ماحول میں پتنگیں اُڑانے اور آنکھیں لڑانے کا شغل دونوں جاری رہتے ہیں۔ ہمارے شاعروں نے بھی بے حد مزے لے کر اس عشق بازانہ پتنگ بازی کو موضوعِ سخن بنایا ہے۔ بعض شعرا کی شاعری کا بسنتی رنگ ملاحظہ کیجئے۔ طارق کھوکھر نامی شاعر کی نظم کا عنوان ہے: 'چھت پر آنا اچھا لگتا ہے'؛ کہتے ہیں:

صبح کو اس کا چھت پر آنا اچھا لگتا ہے دھاگے سے سب کچھ کہہ جانا اچھا لگتا ہے

دن کو نہ تیرا چھت سے جانا اچھا لگتا ہے پتنگ کے سنگ خود لہرانا اچھا لگتا ہے

شام کو تیرا چھت پر آنا اچھا لگتا ہے سب کچھ آنکھوں میں کہہ جانا اچھا لگتا ہے

ایک دوسرے شاعر شاہد کریم انجم بسنت کے موقع پر چھتوں پر انجام دی جانے والی 'ثقافتی' سرگرمیوں کا حال یوں بیان کرتے ہیں:

کتنی سج دھج سے آئی میرے شہر میں آج بسنت زندہ دل لوگوں کے دل پر کرتی ہے راج بسنت

اک اک لمحہ گزر رہا ہے کتنا حسینوں پر ہر کوئی ڈورے ڈال رہا ہے چھت پر کھڑا حسینوں پر

آنکھوں آنکھوں میں ہی لاکھوں یہاں پیچے لگتے ہیں نظروں کی قاتل ڈوری سے یہاں پر گڈے کٹتے ہیں

پیلے رنگ کے طوفانوں میں سبھی ارمان مچلتے ہیں جس جانب بھی دیکھیں، دل کے چور نکلتے ہیں!

باقر نقوی نام کے شاعر کا کلام دیکھئے:

کیا مزہ ہے بسنت کی بہار میں سجنی کے دیدار میں!
دیر تک پتنگ اُڑائے رکھنا اس کے انتظار میں

چھت پر نظریں جمائے رکھنا اس کے انتظار میں
('بسنت لاہور کا ثقافتی تہوار'، نذیر احمد چوہدری، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور)

اچھے اچھے شرفا اس لبرل کلچر کے سیلاب میں خس وخاشاک کی طرح بہتے چلے جاتے ہیں۔ اجتماعی پتنگ بازی کا بدترین پہلو یہی ہے کہ اس کی وجہ سے اجتماعی آوارگی جنم لے رہی ہے مگر اس کا احساس نہیں کیا جارہا۔ اس فسق وفجور سے بھرپور ماحول میں منائی جانے والی بسنت کو جو دانشور ہمارے 'قومی و ثقافتی تہوار' کا نام دیتے ہیں، ان سے گذارش ہے کہ وہ اپنی اس رائے کو دینی حمیت اور قومی غیرت کے آئینے میں لمحہ بھر کے لئے ضرور دیکھیں۔ دینی راہنماؤں کو 'بے روح مذہبیت' اور 'قدامت پرستی' کا طعنہ دینے کی بجائے مناسب ہوگا کہ وہ بسنت کے دلدادہ ان شعرا کے اشعار پر غور فرمائیں۔ کاش کہ وہ قوم کو اس ثقافتی لبرل ازم کے عذاب سے نجات دلانے میں فکری راہنمائی کا فریضہ انجام دیتے!!

بسنت اور ہمارے دانشور صحافی

روزنامہ نوائے وقت، بسنت مخالف تنظیموں، سماجی راہنماؤں اور دینی حلقوں کی طرف سے بسنت کو ہندوانہ تہوار قرار دے کر اس کے خلاف شدید احتجاج کیا جا رہا تھا۔ اسی لئے بسنت کے حامی دانشوروں نے ان تقریبات کے لئے 'بسنت' کا نام استعمال کرنے سے گریز کرنا شروع کر دیا۔ انہوں نے احتیاط کے تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اسے 'پتنگ میلہ' اور 'جشن بہاراں' جیسے نام عطا کئے۔ اس طرح کا معذرت خواہانہ طرزِ عمل بالخصوص ایسے دانشوروں اور صحافیوں کی طرف سے سامنے آیا، جو ہمیشہ دائیں بازو میں شامل رہے ہیں۔ ان کی جانب سے نیمے دروں نیمے بروں والا انداز اپنایا گیا۔

ان حضرات نے 'جشن بہاراں' میں 'پر زور شرکت' بھی فرمائی اور اسے 'اخلاقی حدود کا پابند' رکھنے کی تلقین بھی فرماتے رہے۔ اسلامی اقدار کے فروغ کے لئے اپنے عزائم کا اظہار بھی فرماتے رہے اور ساتھ ہی بسنت کو ہندوانہ تہوار کہنے والوں کو 'بے روح مذہبیت' اور 'قدامت پرستی' کا شکار ہونے کے طعنے بھی دیتے رہے، علمائے کرام کو 'وسیع النظر ہونے' کی تلقین بھی فرماتے رہے، ساتھ ہی نوجوانوں کو سمجھاتے رہے کہ پاکستان کی بنیادی شناخت اس کے نظریہ کے حوالے سے ہے۔ اپنی سرپرستی میں 'دل ہوا بوکاٹا' جیسے گانوں پر نوجوانوں سے بھنگڑے بھی ڈلواتے رہے اور ساتھ ہی اپنے اخبار کے اداریے میں یہ تبلیغ بھی جاری رکھی: "ہماری تقریبات بے خدا معاشروں کی تقریبات سے مختلف ہونی چاہئیں اور نظر بھی آنی چاہئیں۔"

روزنامہ 'پاکستان' کے محترم مدیر صاحب کے فکری اضطراب کا عظیم نمونہ ان کا وہ اداریہ ہے جو ۱۹ / فروری ۲۰۰۲ء کو 'پتنگ میلہ؛ بسنت یا جشنِ بہاراں' کے عنوان سے شائع ہوا۔ اس اداریے کے کچھ حصے ہم قارئین کی دلچسپی کے لئے نقل کر دیتے ہیں، باقی حصے اگر ہو سکے تو پڑھنے کی زحمت وہ خود گوارا کر لیں :

"یہ 'پتنگ میلہ' جسے بسنت کا نام بھی دیا جاتا ہے اور 'جشن بہاراں' کہہ کر بھی پکارا جاتا ہے اب لاہور شہر کی تہذیبی شناخت بن چکا ہے... ایک طرف قوم کا بڑا حصہ بحیثیتِ مجموعی اس میلہ کو قومی تہوار بنا چکا ہے تو دوسری طرف اس پر تنقید بھی جاری ہے۔ روزنامہ پاکستان کے مارکیٹنگ کے شعبے کی طرف سے بھی اس بار اس 'میلے' میں پرزور شرکت کی گئی... ہمارے متعدد قارئین ہم سے بار بار پوچھ رہے ہیں کہ آپ کی رائے کیا ہے اور نظریہ کیا ہے؟ آپ تو اس ہنگامے میں شریک نظر آ رہے ہیں۔" ہم نے ضروری جانا کہ اس موقع پر چند اُمور کی وضاحت کر دی جائے اور اپنی رائے کو کھول کر اپنے قارئین کے سامنے رکھ دیا جائے..."

اداریے کے مندرجہ بالا حصہ پر ہم اختلافِ رائے کا حق استعمال کرتے ہوئے پہلے کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں اور اس کے بقیہ حصے کو بعد میں نقل کریں گے۔ 'پتنگ میلہ' کی ترکیب مروّج نہیں ہے۔ اسے بسنت کا نام دیا نہیں جاتا، یہ شروع ہی سے 'بسنت' ہی کہلاتا ہے۔ اسے لاہور شہر کی 'تہذیبی شناخت' کہنا بھی

تاریخی حقائق کے منافی ہے۔ قابل اعتماد ماخذوں کے مطابق قیامِ پاکستان سے پہلے لاہور کے مسلمانوں کی 'بسنت' میں شرکت نہ ہونے کے برابر تھی۔ آج بھی اندرونِ شہر ہزاروں بزرگ موجود ہیں جو یہ بتاسکتے ہیں کہ قیامِ پاکستان کے بعد بھی چند نوجوان تھے جو منٹو پارک میں پتنگ بازی کا شغل کرتے تھے یا کچھ لوگ مزنگ میں یہ کام کرتے تھے مگر ان کی اس حرکت کو معاشرے میں عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ یہ بات بھی درست نہیں کہ "قوم کا بڑا حصہ بحیثیتِ مجموعی اس میلے کو قومی تہوار بنا چکا ہے۔" لاہور شہر میں بسنت کے مخالف افراد لاکھوں میں ہیں۔ ایک مقامی سطح کی تقریب کو 'قومی تہوار' نہیں کہا جاسکتا۔ بسنت جیسے متنازع فیہ لہو و لعب پر مبنی پروگرام کو قومی تہوار کہنا مناسب نہیں ہے۔

روزنامہ پاکستان کے مذکورہ اداریے کے بقیہ حصے ملاحظہ فرمایئے:

1 " بسنت یا جشن بہاراں یا پتنگ میلہ کے نام پر منایا جانے والا یہ تہوار کسی بھی طور کسی مذہب کے ساتھ وابستہ نہیں ہے۔ نہ یہ کرسمس ہے، نہ دیوالی اور نہ ہولی۔ یہ ایک غیر مذہبی تہوار ہے جسے طویل عرصہ سے منایا جارہا ہے۔

2 پتنگ کسی ہندو کی ایجاد ہے نہ سکھ کی۔ اسے سینکڑوں سال سے مشرق کے آسمان پر اڑایا جارہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اسے اہل چین نے ایجاد کیا۔

3 کوئی بھی ثقافتی تہوار اچھا یا برا نہیں ہوتا، اسکو منانے کے طریقے اسے اچھا یا بُرا بناتے ہیں.

4 مسلمانوں نے اپنی پندرہ سو سالہ تاریخ میں مختلف مقامات پر مختلف مقامی تہواروں کو 'مشرف بہ اسلام' کیا، انکے منانے پر پابندی نہیں لگائی، البتہ انہیں اخلاق کا جامہ پہنا دیا.

5 ہر بات کو کفر اور اسلام کا جھگڑا بنانے کی روش نے ہمیں ماضی میں بہت نقصان پہنچایا ہے۔ اس لئے علمائے کرام اور مذہبی راہنماؤں کو اس سے گریز کرنا چاہئے اور اگر لوگ خوشیوں کے چند لمحے سمیٹنا چاہیں تو ان کے خلاف تلوار لے کر کھڑے نہیں ہو جانا چاہئے۔

6 جہاں لہو و لعب کو حلال نہیں کیا جاسکتا، وہاں ہر شے کو لہو و لعب قرار بھی نہیں دیا جاسکتا۔ اسلام کی تلوار کو وہاں چلانا چاہئے جہاں اسلام کو ضرورت ہو، تلوار لے کر چلنے والے کو یہ حق نہیں دیا جاسکتا کہ وہ ذاتی پسند و ناپسند کو دین کا مسئلہ بنا دے۔"

محترم اداریہ نویس نے مندرجہ بالا سطور میں جو باتیں کی ہیں، ان میں بہت سی اُصولی طور پر درست ہیں، مگر بعض کے متعلق تبصرہ اور اعتراض کی گنجائش موجود ہے۔ مثلاً:

1- یہ ایک ناقابل انکار تاریخی حقیقت ہے کہ بسنت ہندوانہ تہوار رہا ہے۔ راقم الحروف نے محدث کے انہی صفحات میں اپنے ایک مضمون 'بسنت، محض موسمی تہوار نہیں!' میں سکھ، ہندو اور انگریز مؤرخین کی آراء کو پیش کر دیا ہے جنہیں دیکھ کر کوئی بھی حقیقت کا متلاشی اصلی بات کو سمجھ سکتا ہے۔ البیرونی کی رائے ہو یا فرہنگِ آصفیہ میں اندراج، اس بات میں کوئی شک نہیں کہ بسنت بنیادی طور پر ہندوانہ تہوار ہے۔ راقم کا یہ مضمون 'محدث' (فروری ۲۰۰۱ء) کے علاوہ روزنامہ پاکستان میں بھی ۲۰۰۲ء کے بسنت کے موقع پر شائع ہوا۔ روزنامہ نوائے وقت نے 9 / فروری ۲۰۰۳ء کی اشاعت میں تاریخی حقائق کو مفصل طور پر شائع کر کے دکھا دیا کہ بسنت کا پس منظر ہندوانہ تہوار کا ہے۔ البتہ یہ معاملہ الگ ہے کہ کوئی بسنت مناتا ہے، مگر اسے ہندوانہ تہوار نہیں سمجھتا۔

2 - پتنگ بازی پر یہ اعتراض کسی نے وارد نہیں کیا کہ یہ کسی ہندو کی ایجاد ہے۔ اصل اعتراض یہ ہے کہ لاہور میں بسنت کے موقع پر پتنگ بازی کا آغاز گستاخِ رسول حقیقت رائے دھرمی کے میلے سے ہوا۔ تاریخی طور پر یہ بات ثابت ہے۔ سکھ اور ہندو مؤرخین کو بھی اس سے انکار نہیں ہے۔ یہاں روزنامہ نوائے وقت کی رپورٹ 'بسنت کیا ہے؟' کے متعلقہ حصہ کو نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے:

"بسنت اور پتنگ دو الگ الگ مشرکانہ عقائد اور تہواروں کا حصہ ہیں۔ لیکن ان دونوں کا باہم ربط و تعلق کیسے ہوا۔ اس کا پس منظر ہم مسلمانوں کے لئے اس قدر غیرت آموز ہے کہ اگر ہم میں ذرّہ برابر بھی دینی حمیت ہو تو بسنت اور پتنگ کے قریب بھی نہ پھٹکیں۔ در حقیقت ایک گستاخِ رسول حقیقت رائے دھرمی کو نسبت پنچمی کے روز اس کے جرم کی پاداش میں پھانسی دی گئی تھی۔ سکھوں نے بالآخر اس کا بدلہ ان تمام مسلمانوں کو بے دردی سے قتل کر کے لیا جو اس وقوعہ میں کسی نہ کسی طریقے سے ملوث تھے۔ انتقام لینے کی خوشی میں سکھوں اور ہندوؤں نے حقیقت رائے دھرمی کے میلے کے روز اس کی سمادھ پر پتنگیں اڑائیں۔ کیونکہ اس کی پھانسی کا دن بسنت پنچمی تھا۔ اس لئے لاہور میں جو سکھوں کا پایۂ تخت تھا، بسنت و پتنگ لازم و ملزوم سمجھے جانے لگے۔" (نوائے وقت: ۹ / فروری ۲۰۰۳ء)

مشتاق پھلروان، جو پتنگ بازی کے حامی ہیں، لکھتے ہیں:

" بعض قبائل میں پتنگ کے بھجن گائے گئے۔ پتنگ کو دیوتا مانا گیا۔ اس سے دعائیں اور مرادیں مانگی جاتی تھیں۔ یہ اعتقاد بھی دیکھا گیا کہ پتنگ سے بھوت پریت نہیں آتے۔ (کتابچہ :بسنت و پتنگ)

3- اسلامی نقطہ نظر سے کسی بھی تہوار کی اچھائی یا برائی کا تعین کرنے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کی فکری بنیاد کو پرکھا جائے۔ اسلام نے اچھے تہوار (عیدین #) خود بتا دیئے ہیں، اس کے علاوہ کسی ایسے ثقافتی تہوار کو مسلم معاشرہ کے لئے قابل قبول نہیں قرار دیا جاسکتا، جس پر کسی دوسری قوم یا مذہب کی چھاپ ہو۔ بسنت کی فکری بنیاد اور اس کے منانے کا طریقہ دونوں ہی قابل اعتراض ہیں۔

4 - تاریخی طور پر یہ بات درست نہیں ہے کہ اسلام نے اپنی پندرہ سو سالہ تاریخ میں مختلف مقامات پر مختلف مقامی تہواروں کو 'مشرف بہ اسلام' کیا، انہیں اخلاق کا جامہ پہنانے کی بات تو دور کی ہے۔ مسلمانوں نے آٹھ سو برس تک سپین پر حکومت کی، انہوں نے کبھی عیسائیوں کے تہوار کرسمس کو 'مشرف بہ اسلام' کرنے کی کوشش نہ کی۔ انہوں نے فارس پر قبضہ کیا جو آج تک چلا آتا ہے، مگر کبھی انہوں نے پارسیوں کے کسی تہوار کو 'اخلاقی جامہ' پہنا کر نہیں منایا۔ مسلمان بادشاہوں نے نوروز جیسے سالِ نو کے معروف تہوار کو بھی کبھی نہیں منایا۔ ہندوستان میں بھی مسلمانوں نے ہندوؤں کے کسی تہوار کو اپنانے کی کوشش نہ کی۔ دو قومیتوں کی متصادم فطرت کے عنوان سے انگریز مؤرخ مرے ٹائٹس کہتا ہے:

" بارہ طویل صدیوں تک اسلام ہندوستان میں ہندومت کے ساتھ ساتھ رہا۔ بارہ صدیوں تک دونوں قومیں ایک جانب قومیتی اولوالعزمیاں اور دوسری جانب قومیتی تحفظ کے فطری جذبے کی آویزش، اکثر و بیشتر چپقلشوں اور تنازعوں کا باعث بنی رہی اور آج تک جاری ہے۔"

(انڈین اسلام: صفحہ ۱۷۶، ۱۹۳۰ء)

جرمن فلاسفر اوسوالڈ اسپینگلر کے بقول: " ایک مذہبی ثقافتی قوت کے لحاظ سے اسلام بیشتر حیثیتوں میں ہندومت کی عین ضد ہے۔" (زوالِ مغرب)

پروفیسر عزیز احمد جو اسلامی کلچر پر اتھارٹی مانے جاتے ہیں، اپنی معرکہ آرا تصنیف 'برصغیر میں اسلامی کلچر' میں لکھتے ہیں:

"ثانوی ہندوستانی ماحول اور نسلی اثرات سے گھرے رہنے کے باوجود ہندوستان میں اسلام نے ان تمام صدیوں میں اپنا غیر ملکی انداز برقرار رکھا۔ بقول جادوناتھ سرکار: ہندوستانی مسلمان بحیثیتِ کل بدیسی ذہن رہا۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ وہ تھا تو ہندوستان میں لیکن اس کا جز نہیں تھا۔" (صفحہ: ۱۱۰)

5 -بلاشبہ اگر لوگ خوشیوں کے چند لمحے سمیٹنا چاہیں تو ان کے خلاف تلوار لے کر کھڑے نہیں ہونا چاہئے۔ مگر محترم ادار یہ نویس یہ تو بتائیں کہ جب ایک طبقے کی خوشیاں منانے کا انداز دوسرے طبقہ کے لئے عذاب بن جائے تو پھر کیا کیا جائے۔ جب بسنت کے نام پر لہو ولعب اور شاہی قلعہ جیسے پروگرام ہونے لگ جائیں تو کیا پھر بھی چشم پوشی کی جائے؟ بسنت کے مخالف صرف علما ہی تو نہیں ہیں، نوائے وقت جیسے اخبارات، سماجی تنظیمیں اور ہر مکتبہ فکر سے تعلق رکھنے والے لوگ ہیں۔ خوشیاں سمیٹنے کے اور بھی تو بہت طریقے ہیں، آخر ہندوانہ تہوار پر ہی اصرار کیوں کیا جائے!!

6 -ہمارا بھی نقطہ نظر یہ ہے کہ ہر شے کو لہو ولعب قرار نہیں دیا جا سکتا۔ مگر گذشتہ چند برسوں میں 'بسنت' کے 'قومی تہوار' کا مشاہدہ کرنے والا کون سلیم الطبع شخص ہے جو اسے لہو ولعب نہیں سمجھتا؟ اگر کوئی شخص اسے لہو ولعب نہیں سمجھتا، اسے چاہئے قرآن و سنت میں لہو ولعب کے تصور کا خود مطالعہ کر لے۔

ان معروضات کے بعد روزنامہ پاکستان کے اداریے کے یہ الفاظ دیکھئے:

"ہمارے نظریات اور خیالات واضح ہیں۔ اسلام ہمارا سرمایۂ حیات ہے اور ہماری کل کائنات ہے۔ اسلامی اقدار کا فروغ، ان کی پاسبانی اور ترجمانی ہمارے لئے وجہ اعزاز اور وجہ افتخار بھی۔ اسلام ہی ہماری منزل اور اسلام ہی ہماری آرزو ہے لیکن ہم بے روح مذہبیت اور قدامت پرستی کو اسلام قرار دینے کے لئے تیار نہیں ہیں۔"

محترم ادار یہ نویس کے جذبات قابل تعریف ہیں، مگر معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے فرض کر لیا ہے کہ بسنت کی مخالفت کرنے والے سب لوگ 'بے روح مذہبیت' اور 'قدامت پرستی' کا شکار ہیں۔ بسنت کے نام پر لہو ولعب، خرافات، شراب و کباب اور ایک ہندوانہ تہوار کی مخالفت کو وہ جو چاہیں نام دیں، ہم اسے ثقافتی لبرل ازم سمجھتے ہیں اور اسے اسلامی ثقافت قرار دینے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

اس اداریے کا آخری حصہ بھی قابل توجہ ہے:

"ہم پاکستان کے انتہائی ممتاز دانشور جناب اشفاق احمد سے متفق ہیں کہ یہ تہوار پتنگ میلہ ہے... یاد رکھئے 'پتنگ میلے' یا 'جشن بہاراں' کے خلاف محاذ بنانا کارِ لاحاصل ہے، اسے اخلاقی حدود کا البتہ پابند رہنا چاہئے... 'پتنگ میلے' یا 'بسنت' میں جہاں حدود سے تجاوز کیا جائے، وہاں عصائے احتساب کو گردش میں آنا چاہئے۔"

ہمارے خیال میں اس طرح کے لبرل ثقافتی فیسٹیول کو اخلاقی حدود کا پابند بنانے کی خواہش نا قابل عمل ہے۔ اس طرح کے وسیع پیمانے پر ثقافتی ہنگامہ آرائی کو عصائے احتساب کو گردش میں لا کر کنٹرول کرنا بھی ممکن نہیں ہے۔ کسی کام کی کھلم کھلا آزادی دے کر اسے کنٹرول نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا صرف ایک ہی علاج ہے کہ اس طرح کے غیر اخلاقی، سماج دشمن، انسانی جانوں کے لئے خطرناک پروگرامات کی شروع ہی سے بیخ کنی کی جائے۔

پتنگ بازی کے حق میں دلائل

پتنگ بازی پر پابندی اُٹھانے کے حق میں سب سے بڑی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ پتنگ سازی ایک صنعت کا درجہ اختیار کر چکی ہے اور اس سے سینکڑوں خاندانوں کے روزگار وابستہ ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پتنگ اور ڈور کے کاروبار میں ہزاروں لوگوں کے لئے روزگار کے مواقع ہیں۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ لاہور جیسے شہروں میں کیا ایسے کاروبار کو جاری رکھنے کی اجازت دی جا سکتی ہے جس کے نقصانات بھی بہت ہیں۔

جب بھی کوئی ریاست کسی نفع بخش کاروبار یا پیشے کو معاشرے کے اجتماعی مفادات سے متصادم محسوس کرتی ہے، تو اس پر قانونی پابندیاں عائد کر دیتی ہے، اس وقت یہ نہیں دیکھا جاتا کہ اس پابندی سے کتنے خاندانوں کا روزگار متاثر ہوگا۔ صوبہ سرحد کے سنگلاخ پہاڑوں کے درمیان رہنے والے ہزاروں خاندان ایسے ہیں جو پوست (Poppy) کی کاشت سے ہزاروں روپے کی ماہانہ آمدنی حاصل کر رہے تھے اور ان کا بظاہر کوئی متبادل ذریعہ معاش بھی نہیں تھا۔ مگر چونکہ اس سے ہیروئن پیدا ہوتی ہے، اس لئے اسے معاشرے کے لئے خطرناک سمجھ کر اس پر پابندی عائد کر دی گئی۔

ابھی چند سال پہلے میاں نواز شریف کی حکومت نے شادی بیاہ کی تقریبات میں کھانوں پر پابندی عائد کر دی تھی۔ شادی گھروں اور دیگر متعلقہ اداروں نے اس پر کافی احتجاج کیا اور سینکڑوں خاندانوں کے روزگار متاثر ہونے کا واویلا بھی بہت مچایا گیا، مگر چونکہ یہ پابندی معاشرے کے اجتماعی مفاد میں تھی، اسے سماجی حلقوں نے سراہا۔ حال ہی میں لاہور میں ویگنوں کو ختم کر کے بڑی بسوں کو چلانے کی اجازت دی گئی ہے۔ حکومت کے اس فیصلے سے سینکڑوں خاندان متاثر ہوئے ہوں گے، اگر لاہور میں شراب کی کھلے عام اجازت دی جائے تو سینکڑوں خاندان شراب بنانے کو ذریعہ معاش بنا لیں گے۔ مگر کیا محض چند سو خاندانوں کو معاشی وسائل فراہم کرنے کے لئے پورے معاشرے کو نقصان پہنچانے کی اجازت دی جا سکتی ہے؟

آخر اس استدلال کا اطلاق نام نہاد پتنگ سازی کی صنعت پر کیوں نہیں کیا جاتا۔ مزید بر آں پتنگ اور ڈور کا کاروبار چند ہفتوں پر محیط ہوتا ہے، بہت کم لوگ ہیں جو سارا سال اسی کاروبار سے وابستہ رہتے ہوں۔

پتنگ بازی اور بسنت منانے کے حق میں دوسری دلیل یہ دی جاتی ہے کہ بسنت کے موقع پر اربوں روپے کا کاروبار ہوتا ہے۔ نجانے کس طرح اَعدادوشمار جمع کئے جاتے ہیں، مگر کہا جاتا ہے کہ ہر سال تقریباً دو ارب روپے کا کاروبار ہوتا ہے۔ اس کاروبار کی نوعیت کیا ہے؟ ہر سال کروڑوں روپے پتنگ اور ڈور پر خرچ کر دیئے جاتے ہیں، کروڑوں روپے کھابے اُڑانے میں ضائع کر دیئے جاتے ہیں، شراب وسیع پیمانے پر فروخت ہوتی ہے، ہوٹلوں کا کاروبار خوب چمکتا ہے۔ لاکھوں روپے لاہور کی شاہراہوں کو سجانے پر خرچ ہو جاتے ہیں، عمارتوں کی آرائش کے لئے لاکھوں کا خرچہ ہوتا ہے، موسیقی، راگ رنگ، اور مغنیات پر کروڑوں کا خرچ اُٹھتا ہے، بسنتی لباس تیار کرانے میں عورتیں بے دریغ خرچ کرتی ہیں، یہ لباس شاید ایک دن ہی پہنا جاتا ہے۔ گھر گھر ضیافتیں اُڑائی جاتی ہیں۔ کیا ان میں سے کوئی ایک خرچ بھی ایسا ہے جسے تعمیری کہا جاسکے۔ یہ سب اسراف و تبذیر، فضول خرچی اور عیاشی کے زمرے میں آتے ہیں۔ عیاش اور متمول طبقہ بسنت کے موقع پر گوشت اور دیگر اشیاے ضرورت کا اس قدر زیادہ استعمال کرتا ہے کہ اس سے مارکیٹ کئی ہفتے متاثر رہتی ہے۔ طبقہ امرا کی انہی بے جا عیاشیوں کی وجہ سے گوشت جیسی اہم چیز غریب آدمی کی قوتِ خرید میں نہیں رہی۔

ایک ایسی قوم جس پر 36 / ارب ڈالر کا قرضہ واجب الادا ہو، اس کے لئے اس طرح کے غیر تعمیری مصارف پر ایک دن میں اربوں روپے اُڑانا باعثِ فخر نہیں، باعثِ شرم ہی ہے پتنگ بازی کے لئے استعمال ہونے والے سامان کا بہت سارا حصہ بھارت سے درآمد کیا جاتا ہے۔ ہمارے ماہرین معاشیات کو چاہئے کہ وہ قوم کو صحیح حقائق سے آگاہ کریں تاکہ بسنت مافیا نے اربوں روپے کے کاروبار کا جو ڈھونگ اور فسوں رچا رکھا ہے، اس کی حقیقت بھی واضح ہو جائے۔ جس قوم کی ۳۴ فیصد آبادی خطِ افلاس سے بھی نیچے زندہ رہنے پر مجبور ہو، اس قوم کی اشرافیہ کے لئے یہ بسنتی تعیشات وجہ افتخار نہیں ہو سکتے!!

مزید بر آں لیسکو کے چیئرمین اور لاہور کے ضلعی ناظم کے بیان کے مطابق گزشتہ سال دھاتی تار کی وجہ سے بجلی کی ہونے والی ٹرپنگ سے لیسکو کو اڑھائی ارب کا نقصان اٹھانا پڑا۔ (پتنگ بازی پر پابندی کیوں؟ از میاں عامر محمود، روزنامہ پاکستان: یکم جولائی ۲۰۰۳ء)

بجلی کی بار بار ٹرپنگ سے گھریلو اشیا اور صنعتوں کی پیداوار کو پہنچنے والے نقصان کا تو اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ دو ارب کے کاروبار کی بات کرنے والوں کو ان نقصانات کو سامنے رکھ کر معاشی میزانیہ مرتب کرنا چاہیے۔

۲۰۰۳ء میں بسنت کو لاہور میں جوش و خروش سے منایا گیا، مگر سرکاری سرپرستی میں قدرے کمی آ گئی۔ دھاتی ڈور کی وجہ سے ہونے والی ہلاکتوں کا شدید ردّ عمل بھی سامنے آیا۔ بسنت کے بعد بھی جب ہلاکتوں اور واپڈا کے نقصانات کا سلسلہ جاری رہا تو ضلعی حکومت اپنی پالیسی بدلنے پر مجبور ہو گئی۔ یکم جولائی ۲۰۰۳ء سے پتنگ بازی پر پابندی لگا دی گئی۔ میاں عامر محمود نے اس پابندی کی وجوہات بیان کرتے ہوئے کہا کہ گزشتہ دو ماہ میں پتنگ بازی کی وجہ سے ۱۷ قیمتی جانیں ضائع ہوئیں اور گزشتہ سال لیسکو کو اڑھائی ارب کا نقصان برداشت کرنا پڑا۔

یہ بات حیران کن نہیں کہ اس پابندی کو ان دانشوروں نے بھی سراہا جنہوں نے بسنت کو قومی و ثقافتی تہوار کے طور پر منانے کے لیے سو سو تاویلات پیش کی تھیں۔ ذرائع ابلاغ نے اور سماجی حلقوں نے بھی اس پابندی کو نگاہِ تحسین سے دیکھا۔ اس کے علاوہ لاہور کی خونی بسنت (۹ / فروری ۲۰۰۳ء) کے بعد راولپنڈی، گوجرانوالہ، قصور اور حافظ آباد کے ضلعوں کے ناظمین نے اپنے اپنے ضلع میں بسنت منانے پر فوری طور پر پابندی عائد کر دی۔

درج ذیل منتخب بیانات اور رپورٹوں سے مثبت عوامی رد عمل کو بخوبی جانچا جا سکتا ہے:

پابندی پر خیر مقدمی بیانات

1 پی ایچ اے کے سربراہ کامران لاشاری نے اس پابندی پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ

"جو مزاجِ حکومت میں آئے ہمارا سر تسلیم خم ہے۔ پابندی پر میرا تبصرہ صرف اتنا ہے کہ ہم سرنگوں کر دیں گے۔" (نوائے وقت: ۳/ جولائی ۲۰۰۳ء)

2 "پتنگ بازی پر پابندی کی خلاف ورزی کرنے والوں کے ساتھ سختی سے نمٹا جائے گا۔" (وزیر اعلیٰ پرویز الٰہی کا بیان شائع شدہ جنگ: ۲/ جولائی ۲۰۰۳ء)

3 ضلعی حکومت لاہور نے انسانی جانیں بچانے کے لئے صحیح وقت پر صحیح قدم اٹھایا۔ (نوائے وقت: ۲/ جولائی ۲۰۰۳ء)

4 بے گناہ بچوں اور نوجوانوں کے خون سے پہلے ہی پتنگ بازی پر پابندی لگنی چاہئے تھی۔ ('انصاف' سروے: ۲/ جولائی ۲۰۰۳ء)

5 پتنگ بازی پر پابندی؛ ایک مستحسن فیصلہ۔ (روزنامہ 'دن' کا اداریہ، ۲ جولائی ۲۰۰۳ء)

6 ”میاں عامر محمود نے عوامی مفاد میں ایک انسانی قدم اٹھایا ہے تو اسے اپنے موقف پر چٹان کی طرح ڈٹ جانا چاہئے اور بے شک میاں عامر محمود اس سلسلہ میں مبارکباد اور شاباش کا مستحق ہے کہ اس نے ووٹ بنک اور مافیا کی پرواکئے بغیر معصوم اور بے گناہ شہریوں کے قتل عام کو لگام دینے کا آغاز کیا۔“ (حسن نثار کا کالم 'چوراہا' روزنامہ 'جنگ' ' قتل عام اور میاں عامر ' ۲ / جولائی ۲۰۰۳ء)

7 ”پتنگ بازی پر پابندی ضلعی حکومت کا پسندیدہ اقدام ہے۔ لیکن اس پر مکمل طور پر عمل درآمد نہ ہوا تو یہ ضلعی حکومت کی بدنامی کا باعث بھی بن سکتا ہے۔ ہم والدین سے بھی گذارش کریں گے کہ وہ اپنے بچوں کو پتنگ بازی کے فصول شوق سے منع کریں۔ سماجی انجمنوں کے راہنماؤں، علمائے کرام اور معاشرہ کے بااثر افراد کو اس سلسلے میں اپنا کردار ادا کرنا چاہئے۔“ (روزنامہ 'پاکستان' کا اداریہ، یکم جولائی ۲۰۰۳ء)

8 پتنگ بازی پر پابندی لگانے سے ہم ضلعی ناظم کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ ایسی پابندی پورے ملک میں لگائی جائے۔

(انجمن تاجرانِ گلبرگ، ایکسپریس، یکم جولائی ۲۰۰۳ء)

9 حکومت تین ماہ کی بجائے ہمیشہ کے لئے پتنگ بازی اور ڈور بنانے پر پابندی عائد کرے۔ پتنگیں بنانے اور اُڑانے والوں کو پھانسی دی جائے۔ (اینٹی کائٹ فلائنگ ایسوسی ایشن۔ 'پاکستان' یکم جولائی ۲۰۰۳ء)

10 ہمارے اس اقدام کا عوام نے بڑے جوش و خروش کے ساتھ خیر مقدم کیا ہے۔

11 ”بہر کیف بعد از خرابی بسیار ہماری بلدیاتی حکومت نے اس طرف توجہ دی ہے اور اعلان کیا ہے کہ فی الحال تین ماہ کے لئے اس خون ریزی کا سامان بند رکھا جائے گا۔ اگر میاں عامر صاحب اس حکم پر عملدرآمد کرا لیتے ہیں تو ان کو لاہوریوں کی طرف سے شاباش ملنی چاہئے۔“ (عبدالقادر حسن، جنگ کالم، ۲۶ / جون ۲۰۰۳ء)

12 طویل عرصے بعد یہ پہلی اتوار تھی جب لوگوں نے چھٹی کا دن اپنے گھروں میں آرام سے گذرا۔

(کالم عباس اطہر 'کنکریاں': ۸ جولائی ۲۰۰۳ء)

13 میاں عامر کو مبارکباد کہ انہوں نے اہل لاہور کو ایک عذاب سے بچایا۔ (عبدالقادر حسن، جنگ کالم، ۹ / جولائی ۲۰۰۳ء)

14 پتنگ بازی پر پابندی کو لاہور یئے قبول نہیں کریں گے۔(مخالفت میں واحد آواز)　　　(یوسف صلاح الدین، ایکسپریس:　　۲ جولائی ۲۰۰۳ء)

پتنگ بازی پر پابندی

اگست ۲۰۰۳ء میں لاہور سٹی گورنمنٹ نے لاہور شہر میں پتنگ بازی پر دوماہ کے لئے پابندی لگادی۔ سماجی حلقوں نے اس فیصلے کو بے حد سراہااور مطالبہ کیا کہ یہ پابندی مستقل بنیادوں پر عائد کر دی جائے۔ کائٹ فلائنگ ایسوسی ایشن نے اسے ہائی کورٹ میں چیلنج کیا مگر ضلعی حکومت نے بجلی ٹرپنگ، پانی کی بندش اور پتنگ بازی کے نتیجے میں ہونے والی ہلاکتوں کے اَعدادوشمار کو اپنے دفاع میں ایں طور پیش کیا کہ ہائی کورٹ نے اس پابندی کو برقرار رکھنے کی اجازت دی۔ عوام الناس نے بھی سکھ کا سانس لیا۔ مگر بسنت اور پتنگ بازی کی حامی تنظیموں اور اداروں کی طرف سے اس پابندی کے خلاف احتجاج جاری رہا۔

ضلعی حکومت کی طرف سے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی جسے پتنگ بازی پر پابندی کے بارے میں سفارشات مرتب کرنے کو کہا گیا۔ ضلعی ناظم میاں عامر محمود اس کمیٹی کے سربراہ تھے، دیگر ارکان میں سینیٹر خالد رانجھا، عارف نظامی، ضیاء شاہد، مجیب الرحمن شامی، ابتسام الٰہی ظہیر، مقصود احمد قادری، حیدر علی مرزا، خالد سلطان، کائٹ ایسوسی ایشن کے ملک شفیع اور میاں عبد الوحید شامل تھے۔ مؤرخہ　۸ / جنوری ۲۰۰۴ء کو کمیٹی نے اپنی سفارشات پیش کیں جس میں اتفاق رائے سے یہ مطالبہ شامل تھا کہ محض جشن بہاراں کے لئے مذکورہ پابندی غیر مشروط طور پر نہ اٹھائی جائے، دھاتی تار اور تندی کے استعمال کے باعث ہونے والے نقصان کی روک تھام کے لئے باقاعدہ قانون سازی کی جائے۔

کمیٹی کے ۸ / ارکان نے پتنگ بازی پر پابندی مستقل طور پر برقرار رکھنے اور دس ارکان نے کھیل کے قواعدوضوابط وضع کر کے اس کی اجازت دینے کے حق میں رائے دی۔ کمیٹی نے تجویز کیا کہ لاہور کی حدود میں پتنگ بازی پر مستقل طور پر پابندی عائد کر دی جائے، تاہم شہر سے باہر کھلے میدانوں مثلاً جلو پارک، رائے ونڈ لاہور، لاہور پارک، ڈیفنس گراؤنڈ، شاہدرہ گراؤنڈ وغیرہ تک محدود کر دیا جائے۔ دھاتی تار استعمال کرنے والوں سے جرمانہ وصول کیا جائے۔ ارکانِ قومی وصوبائی اسمبلی، وزراء، سرکاری افسران اور دیگر معروف شخصیات پتنگ بازی کی سرگرمیوں سے خود کو علیحدہ رکھیں تاکہ میڈیا ان سرگرمیوں کی نمایاں کوریج نہ کر سکے۔ موٹا دھاگہ استعمال کرنے پر پابندی کے علاوہ ان دنوں کے بعد سارا سال پتنگ اور ڈور کی خرید وفروخت پر مکمل پابندی عائد ہو۔

(نوائے وقت: ۹ / جنوری ۲۰۰۴ء)

مذکورہ بالا کمیٹی کی سفارشات کے علی الرغم حکومت پنجاب نے ۲۰ / جنوری ۲۰۰۴ء سے ۲۰ / فروری ۲۰۰۴ء تک پتنگ بازی سے پابندی اٹھانے کا اعلان کیا۔ البتہ دھاتی ڈور اور تندی کے استعمال پر پابندی کو بدستور برقرار رکھا۔ (نوائے وقت: ۱۵ / جنوری ۲۰۰۴ء)

سنا ہے کہ ضلعی ناظم میاں عامر محمود اس پابندی کو اٹھانے کے حق میں نہیں تھے۔ وزیر اعلیٰ پنجاب جناب پرویز الٰہی بھی بسنت اور پتنگ بازی کے حامی نہیں ہیں۔ ۲۰۰۳ء کی بسنت کے موقع پر انہوں نے اپنے آپ کو بسنتی پروگراموں سے الگ تھلگ رکھا۔ وہ کسی بھی پروگرام میں شریک ہوئے، نہ ہی انہوں نے سرکاری طور پر بسنت کی سرپرستی کی۔

۲۰ / جنوری ۲۰۰۴ء کو پتنگ بازی پر پابندی اُٹھائی گئی۔ اس کے بعد آنے والے پہلے اتوار (۲۵ / جنوری) کو تین ہلاکتیں رپورٹ ہوئیں۔ ۲۰ / سالہ ناصر جاوید دھاتی تار والی پتنگ پکڑتے ہوئے کرنٹ لگنے سے جاں بحق ہو گیا۔ شاد باغ کا ایک نوجوان علی موٹر سائیکل پر جارہا تھا کہ اس کے گلے میں پتنگ کی دھاتی تار پھر گئی۔ (جنگ) دریں اثنا فیروز پور روڈ پر ایک موٹر سائیکل سوار سکندر اکرام کی گردن ڈور کی زد میں آکر کٹ گئی۔ (نوائے وقت)

8 حکومتِ پنجاب کو چاہیے کہ وہ شہریوں کی قیمتی جانوں کے تحفظ کے لیے پتنگ بازی پر پابندی اُٹھانے کے فیصلہ پر نظر ثانی کرے۔

بسنت اور پتنگ بازی جیسے جان لیوا شغل پر پابندی عائد ہونی چاہیے، کیونکہ...

1 ہندوؤں کے موسمی تہوار بسنت کا بنیادی فلسفہ اسلام کے ثقافتی نصب العین کے منافی ہے۔

2 بسنت کے پردے میں پاکستان میں مغربی لبرل ازم کو فروغ دیا جارہا ہے۔

3 بسنت اور پتنگ بازی کی وجہ سے انسانی جانیں غیر محفوظ ہیں۔

4 پتنگ بازی کی وجہ سے واپڈا جیسے قومی اداروں کو اربوں کا نقصان برداشت کرنا پڑا۔

5 بسنت کا نام نہاد تہوار اسراف و تبذیر اور فضول خرچی کا باعث بنتا ہے۔

6 بسنت کے موقع پر ہلڑ بازی اور شور سے سماجی سکون تلپٹ ہوتا ہے۔

7 یہ بات تاریخی طور پر ثابت ہے کہ لاہور میں بسنت پنچمی کا میلہ گستاخِ رسول حقیقت رائے دھرمی کی یاد میں شروع ہوا۔ مسلمانوں کی دینی حمیت سے بعید ہے کہ وہ اس طرح کے میلے کو منائیں۔

'بسنت' محض موسمی تہوار نہیں!

(محمد عطاء اللہ صدیقی)

مذہب اور ثقافت ایک دوسرے پر اثر انداز بھی ہوتے ہیں اور ایک دوسرے سے اثر پذیر بھی۔ ہمارے ہاں عام طور پر مذہب اور ثقافت کو دو الگ الگ تہذیبی دائروں کے طور پر زیر بحث لایا جاتا ہے، یہ زاویۂ نگاہ قطعاً درست نہیں۔ سیکولر طبقہ اپنے مذہب بیزار رویے کی وجہ سے ثقافتی اُمور میں مذہب کے کردار کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہے، لہٰذا جہاں کہیں مذہب اور ثقافت کے درمیان رشتوں کی بات ہوتی ہے، وہ ہمیشہ مذہب کی تخویف اور ثقافت کی تعریف و توصیف کا اُسلوب اختیار کرلیتا ہے۔ یہ طبقہ تناقض فکر میں مبتلا ہے۔ اسے مذہب سے والہانہ وابستگی تو سخت ناگوار گذرتی ہے، مگر ثقافت سے جنون کی حد تک لگاؤ پر کسی قسم کا عقلی اعتراض نہیں ہوتا۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ سیکولر طبقہ نے شعوری یا غیر شعوری طور پر ثقافت کو ہی 'مذہب' کا درجہ دے دیا ہے۔ ہمارے ہاں مغرب زدہ روشن خیالوں کا ایک گروہ ثقافت کو تو قدیم اور پائیدار سمجھتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ ایک قوم پر ثقافت کے اثرات اس قدر گہرے ہوتے ہیں کہ مذہب انہیں جڑ سے اکھاڑنے میں کامیاب نہیں ہوسکتا، مگر ایسا محض وہی لوگ سوچتے ہیں جو انسانی تاریخ کے ارتقا کو سطحی انداز سے لیتے ہیں۔ اگر وہ تہذیب و تمدن کے آغاز وارتقا پر غور فرمائیں تو انہیں اپنی اس سطحی سوچ پر شاید ندامت کا احساس ہو کیونکہ جن اَقدار اور سرگرمیوں کو آج وہ خالصتاً ثقافتی اور تہذیبی اَقدار سمجھتے ہیں، ان کا حقیقی پس منظر مذہبی ہی ہے۔

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ انسانی تاریخ کے دورِ اوّل میں مذہب کا انسانی معاشرے پر بہت گہرا اثر رہا ہے۔ اس دور میں مذہبی اور الہامی تعلیمات کے خلاف عقلی بغاوت کا تصور تک نہیں تھا، اس لئے قدیم انسانی معاشرے میں کسی ایسے تہوار یا ثقافتی سرگرمی کا رواج پانا ممکن نہیں تھا جس کی تائید مذہبی تعلیمات سے نہ ہوتی تھی۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق کرۂ ارض پر قدم رکھنے والا پہلا انسان خدا تعالیٰ کا فرستادہ پیغمبر تھا یعنی حضرت آدم علیہ السلام۔ اس کے

بعد انبیاء کرام علیہ السلام کا ایک طویل سلسلہ ہے جو وقتاً فوقتاً مبعوث ہوتے رہے۔ انبیاءِ کرام علیہ السلام کے زیر اثر جو تہذیب و تمدن فروغ پایا، اس کی اساس یقیناً مذہبی ہی تھی۔ اگرچہ بعد میں مذہب سے جزوی روگردانی کی صورتیں بھی نمودار ہوئیں لیکن مذہب کی اساسی تعلیمات کا اثر کبھی بھی کلیۃً ختم نہیں ہوا۔ کسی ثقافتی سرگرمی کے صحیح یا غلط، جائز یا ناجائز قرار دینے میں ہمیشہ مذہب کو معیار اور میزان تسلیم کیا گیا۔ ایسی ثقافتی سرگرمیاں جو مذہب کے اَساسی تصورات سے متصادم نہیں تھیں، انہیں بالعموم جائز قرار دیا گیا، اس کے برعکس مذہبی روح سے ٹکرانے والی اَقدار اور سرگرمیوں کو ناپسندیدہ قرار دے کر لہو ولعب گردانا گیا۔ ثقافت اور مذہب کے باہمی رشتوں کی موزونیت کا تعین کرنے کے لئے آج بھی قابل اعتماد معیار وہی ہے، اس معیار اور میزان کو قائم رکھنے سے ہی معاشرے کا توازن قائم رکھا جاسکتا ہے!!

اقوامِ عالم کے معروف ترین تہواروں کی تاریخ پر نگاہ ڈالی جائے تو معلوم ہو گا کہ وہ ایک مخصوص پس منظر رکھتے ہیں۔ یہودیوں کا سب سے بڑا تہوار 'ھنوکا' ایک مذہبی تہوار ہے۔ اَعداد و شمار کے اعتبار سے عیسائیت کو دنیا کا سب سے بڑا مذہب سمجھا جاتا ہے، عیسائی معاشرے میں کرسمس اور ایسٹر بے حد جوش وخروش سے منائے جاتے ہیں۔ ہندومت کا شمار قدیم ترین مذاہب میں ہوتا ہے۔ ہندو معاشرے میں مختلف تہوار منائے جاتے ہیں۔ مثلاً دیوالی، دسہرا، ہولی، بیساکھی، بسنت وغیرہ۔ ان تمام تہواروں میں ادا کی جانے والی رسومات کو ہندومت میں 'مذہبی عبادات' کا درجہ حاصل ہے۔ دیوالی، دسہرا اور ہولی کے متعلق تو سب جانتے ہیں کہ یہ ہندوؤں کے مذہبی تہوار ہیں، مگر بیساکھی اور بسنت وغیرہ کے متعلق یہ غلط فہمی عام پائی جاتی ہے کہ یہ موسمی اور ثقافتی تہوار ہیں۔ ایسا صرف وہی لوگ سمجھتے ہیں جو ان تہواروں میں حصہ تو لیتے ہیں، البتہ ان کا پس منظر جاننے کی زحمت انہوں نے کبھی گوارا نہیں کی۔

اسلامی تاریخ کے قابل فخر محقق اور سائنسدان علامہ ابوریحان البیرونی تقریباً ایک ہزار سال قبل ہندوستان تشریف لائے تھے۔ انہوں نے کلر کہار (ضلع چکوال) کے نزدیک ہندوؤں کی معروف یونیورسٹی میں عرصہ ٔدراز تک قیام کیا، وہیں انہوں نے اپنی شہرئہ آفاق تصنیف 'کتاب الہند' تحریر کی۔ یہ کتاب آج بھی ہندوستان کی تاریخ کے ضمن میں ایک مستند حوالہ سمجھی جاتی ہے۔ اس کتاب کے باب ۷۶ میں انہوں نے "عیدین اور خوشی کے دن" کے عنوان کے تحت ہندوستان میں منائے جانے والے مختلف مذہبی تہواروں کا ذکر کیا ہے۔ اس باب میں عید 'بسنت' کا ذکر کرتے ہوئے علامہ البیرونی لکھتے ہیں:

" اسی مہینہ میں استوائے ربیعی ہوتا ہے، جس کا نام بسنت ہے، اس کے حساب سے اس وقت کا پتہ لگا کر اس دن عید کرتے ہیں اور برہمنوں کو کھلاتے ہیں، دیوتاؤں کی نذر چڑھاتے ہیں"۔

بسنت کو آج کل ”پالا اُڑنت“ کا نام دے کر موسمی تہوار بتایا جاتا ہے مگر اس کا ذکر البیرونی کے بیان میں نہیں ملتا۔ دوسرے یہ کہ البیرونی کے بیان کے مطابق ہندو جوتشی ہر سال استوائے ربیعی کا تعین کر کے 'یومِ بسنت' کا اعلان کرتے ہیں، یہی تصور آج تک چلا آرہا ہے۔ بیساکھی کا تہوار بیساکھ کے مہینے میں گندم کی کاشت کے موقع پر کیا جاتا ہے۔ بظاہر یہ بھی ایک ثقافتی تہوار ہے مگر اس موقع پر ہندو کاشتکار برہمنوں کو گندم کے نذرانے دیتے ہیں اور دیوتاؤں سے گندم کی فصل کے زیادہ ہونے کی دعائیں کی جاتی ہیں۔ چونکہ ہندومت کے بارے میں عام لوگوں کو بہت زیادہ معلومات نہیں ہیں، اسی لئے ہندوؤں کے تہواروں کے مذہبی پس منظر کا انہیں علم نہیں ہے۔ یہ بھی جہالتِ جدیدہ کی ایک صورت ہے کہ کسی چیز کے بارے میں علم نہ ہونے کے باوجود اس کے متعلق قطعی رائے کا اظہار کر دیا جاتا ہے۔ جو لوگ بسنت کو محض موسمی اور ثقافتی تہوار کہنے پر اصرار کرتے ہیں، وہ بھی اسی لاعلمی کا شکار ہیں۔ وہ جان بوجھ کر اس 'لاعلمی' کا شکار رہنا چاہتے ہیں، تو یہ ان کا اپنا انتخاب ہے، مگر انہیں رائے عامہ کو گمراہ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے!!

آج کل بسنت اور پتنگ بازی کو لازم وملزوم تصور کیا جاتا ہے، حالانکہ قدیم تاریخ میں بسنت کے تہوار کے ساتھ پتنگ بازی کا ذکر نہیں ملتا۔ آج جس انداز میں بسنت منانے کا مطلب ہی پتنگ بازی لیا جاتا ہے، یہ تصور بہت زیادہ پرانا نہیں ہے۔ مزید برآں بسنت کے موقع پر پتنگ بازی کا شغل بھی لاہور اور اس کے گردونواح میں برپا کیا جاتا ہے، اس کا اہتمام ہندوستان یا پنجاب کے دیگر علاقوں میں اس انداز سے نہیں کیا جاتا۔ آج سے دس پندرہ سال پہلے پنجاب کے قدیم ترین شہر ملتان میں بسنت کے موقع پر پتنگ بازی کا تصور تک نہیں تھا۔ یہی صورت بہاولپور، ڈیرہ غازی خان، راولپنڈی اور سرگودھا جیسے بڑے شہروں کی ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر لاہور میں بسنت کے موقع پر پتنگ بازی کا شغل اس قدر جوش وخروش سے کیوں برپا کیا جاتا ہے؟ تاریخ اور مذہب کے آئینے میں جھانک کر اس سوال کا جواب تلاش کرنا ضروری ہے۔

اگر بسنت محض موسمی تہوار ہوتا تو یہ صرف لاہور ہی نہیں، پاکستان کے دیگر علاقوں میں بھی اتنا ہی مقبول ہوتا۔ اندرونِ سندھ میں جہاں اب بھی ہندوؤں کی کثیر تعداد رہائش پذیر ہے، وہاں پتنگ بازی یا بسنت کی وہ ہنگامہ آرائی نظر نہیں آتی جس کا مظاہرہ لاہور یا اس کے گردونواح میں کیا جاتا ہے۔ ایسی صورتحال بلاوجہ نہیں ہے۔ اس کا ایک مخصوص تاریخی پس منظر ہے۔ روزنامہ نوائے وقت میں بسنت کے بارے میں تجزیاتی رپورٹ شائع ہوئی، اس کے متعلقہ حصے ملاحظہ فرمائیے:

”بسنت خالص ہندو تہوار ہے اور اس کا موسم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بھارت میں بسنت کی کہانی ہر سکول میں پڑھائی جاتی ہے لیکن لاعلمی یا بھارتی لابی کی کوششوں سے بسنت کو اب پاکستان میں مسلمانوں نے موسمی تہوار بنالیا ہے۔ بسنت کی حقیقت کیا ہے اور اس کا آغاز کیسے ہوا، اس بارے میں

ایک رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ قریباً دو سو برس قبل لاہور کے ایک ہندو طالب علم حقیقت رائے نے محمد مصطفی ﷺ کے خلاف دشنام طرازی کی۔ مغل دور تھا اور قاضی نے ہندو طالب علم کو سزائے موت سنادی۔ اس ہندو طالب علم کو کہا گیا کہ وہ اسلام قبول کرلے تو اسے آزاد کر دیا جائے گا مگر اس نے اپنا دھرم چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ چونکہ اس نے اقرارِ جرم کر لیا تھا، لہٰذا اسے پھانسی دے دی گئی۔ پھانسی لاہور میں علاقہ گھوڑے شاہ میں سکھ نیشنل کالج کی گراؤنڈ میں دی گئی۔ قیام پاکستان سے پہلے ہندوؤں نے اس جگہ یادگار کے طور پر ایک مندر بھی تعمیر کیا لیکن یہ مندر آباد نہ ہو سکا اور قیامِ پاکستان کے چند برس بعد سکھ نیشنل کالج کے آثار بھی مٹ گئے۔ اب یہ جگہ انجینئرنگ یونیورسٹی کا حصہ بن چکی ہے۔ ہندوؤں نے اس واقعہ کو تاریخ بنانے کے لئے، اپنے اس ہندو طالب علم کی 'قربانی' کو بسنت کا نام دیا اور جشن کے طور پر پتنگ اُڑانے شروع کر دیئے۔ آہستہ آہستہ یہ پتنگ بازی لاہور کے علاوہ انڈیا کے دوسرے شہروں میں بھی پھیل گئی۔ اب ہندو تو اس بسنت کی بنیاد کو بھی بھول چکے مگر پاکستان میں مسلمان بسنت منا کر اِسلام کی رسوائی کا اہتمام کرتے رہتے ہیں" (روزنامہ نوائے وقت، ۴ فروری ۱۹۹۴ء)

ہندو نوجوان حقیقت رائے دھرمی کو توہین رسالت کے جرم میں سن ۱۸۰۳ء بکرمی بمطابق ۱۷۴۷ عیسوی میں موت کی سزا دی گئی۔ اس وقت پنجاب کا گورنر زکریا خان تھا۔ زکریا خان ایک صحیح العقیدہ غیور مسلمان تھا۔ وہ جدید دور کے مسلمان حکمرانوں کی طرح بے حمیت نہیں تھا، اس نے توہین رسالت کے مجرم ہندو نوجوان کی موت کی سزا معاف کرنے سے قطعاً انکار کر دیا۔ ہندوؤں نے حقیقت رائے دھرمی کو 'ہیرو' کا درجہ دے دیا اور اس کی یاد میں 'بسنت میلہ' منانا شروع کر دیا۔ چونکہ حقیقت رائے کی شادی ایک سکھ لڑکی سے ہوئی تھی اس لئے سکھ برادری بھی ہندوؤں کے اس 'غم' میں برابر کی شریک تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستان میں 'بسنت' منانے کا تصور زمانہ قدیم سے تھا مگر پنجاب میں بالعموم اور لاہور میں بالخصوص اس تہوار کو عوامی پذیرائی اس میلے کی وجہ سے حاصل ہوئی جس کا آغاز ہندوؤں نے حقیقت رائے دھرمی کی یاد میں کیا۔ اس بات کا اعتراف متعصّب ہندو و سکھ مؤرخین بھی کرتے ہیں۔ ایک ہندو مؤرخ ڈاکٹر بی ایس نجار (Dr. B.S. Nijjar) نے اپنی کتاب "Punjab under the later Mughals" میں حقیقت رائے کو دی جانے والی سزا کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

"حقیقت رائے باگھ مل پوری، سیالکوٹ کے کھتری کا پندرہ سالہ لڑکا تھا جس کی شادی بٹالہ کے کشن سنگھ بھٹہ نامی سکھ کی لڑکی کے ساتھ ہوئی تھی۔ حقیقت رائے کو مسلمانوں کے سکول میں داخل کیا گیا تھا جہاں ایک مسلمان ٹیچر نے ہندو دیوتاؤں کے بارے میں کچھ توہین آمیز باتیں کیں۔ حقیت رائے نے اس کے خلاف احتجاج کیا اور اس نے بھی انتقاماً پیغمبر اسلام ﷺ اور سیدہ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کی شان میں نازیبا الفاظ استعمال کئے۔ اس جرم پر حقیقت رائے کو گرفتار کر کے

عدالتی کارروائی کے لئے لاہور بھیجا گیا۔ اس واقعہ سے پنجاب کی ساری غیر مسلم آبادی کو شدید دھچکا لگا۔ کچھ ہندو افسر زکریا خان جو اس وقت گورنر لاہور تھا، کے پاس پہنچے تا کہ حقیقت رائے کو معاف کر دیا جائے لیکن زکریا خان نے کوئی سفارش نہ سنی اور سزائے موت کے حکم پر نظر ثانی سے انکار کر دیا جس کے اجرا میں پہلے مجرم کو ایک ستون سے باندھ کر اسے کوڑوں کی سزا دی گئی۔ اس کے بعد اس کی گردن اُڑا دی گئی۔ یہ سال ۱۷۳۴ء کا واقعہ ہے جس پر پنجاب کی تمام غیر مسلم آبادی نوحہ کناں رہی۔ لیکن خالصہ کمیونٹی نے آخر کار اس کا انتقام مسلمانوں سے لیا اور سکھوں نے ان تمام لوگوں کو جو اس واقعہ سے متعلق تھے، انتہائی بے دردی سے قتل کر دیا" اسی کتاب کے صفحہ ۲۷۹ پر ڈاکٹر ایس بی نجار نے تحریر کیا ہے کہ "پنجاب میں بسنت کا میلہ اسی حقیقت رائے کی یاد میں منایا جاتا ہے"!

ہندو مؤرخ ڈاکٹر نجار کی یہ بات تو محل نظر ہے کہ مذکورہ بالا واقعہ سے "پنجاب کی ساری غیر مسلم آبادی کو شدید دھچکا لگا" کیونکہ آج سے دو سو سال قبل ذرائع اِبلاغ اس قدر تیز نہیں تھے کہ ایسے واقعہ کی اطلاع صدر مقام سے دور کے علاقوں تک بھی پہنچ سکے، البتہ اس سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ لاہور کے ہندوؤں کے ایک گروہ نے اس واقعہ کے خلاف شدید جذباتی ردّ عمل کا اظہار کیا۔ کیونکہ اس وقت پنجاب میں مسلمانوں کی حکومت تھی، طبعاً بزدل مزاج ہندوؤں کے لئے یہ تو ممکن نہ تھا کہ وہ بھرپور تحریک چلاتے، البتہ انہوں نے حقیقت رائے کی یاد میں میلہ منانا شروع کر دیا جو احتجاج کی ایک نرم مگر مؤثر صورت تھی۔ اس واقعہ کے تقریباً پچاس سال بعد پنجاب میں سکھوں نے مسلمانوں کو شکست دے کر تخت لاہور پر قبضہ کر لیا۔ سکھ تو پہلے ہی بہت جذباتی ردّ عمل کا اظہار کرتے ہوئے اس واقعہ کے 'ذمہ دار' مسلمانوں کو قتل کر چکے تھے۔ جب وہ پنجاب میں برسر اقتدار آئے تو انہوں نے اس واقعہ کے حوالے سے بسنت کا تہوار جوش و خروش سے منانا شروع کر دیا۔ ایک انگریز مؤرخ الیگزینڈر برنز جو مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانہ میں لاہور آئے تھے، انہوں نے یہاں بسنت منانے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"بسنت کا تہوار جو بہار کا تہوار تھا، ۶ فروری کو بڑی شان و شوکت سے منایا گیا۔ رنجیت سنگھ نے ہمیں اس تقریب میں مدعو کیا اور ہم اس کے ہمراہ ہاتھیوں پر سوار ہو کر اس میلہ کی بہار دیکھنے چلے جو بہار کا خیر مقدم کرنے کے لئے منایا جاتا ہے۔ لاہور سے میلہ تک مہاراجہ کی فوج دو رویہ کھڑی ہوتی ہے۔ مہاراجہ گذرتے وقت اپنی فوج کی سلامی لیتا ہے۔ میلہ میں مہاراجہ کا شاہی خیمہ نصب تھا جس پر زرد رنگ کی ریشمی دھاریاں تھیں۔ خیمہ کے درمیان میں ایک شامیانہ تھا جس کی مالیت ایک لاکھ روپے تھی اور اس پر موتیوں اور جواہرات کی لڑیاں آویزاں تھیں۔ اس شامیانہ سے شاندار چیز کوئی نہیں ہو سکتی۔ مہاراجہ نے بیٹھ کر پہلے گرنتھ صاحب کا پاٹھ سنا، پھر گرنتھی کو تحائف دیئے اور مقدس کتاب کو دس جزدانوں میں بند کر دیا۔ سب سے اوپر والا جزدان بسنتی مخمل کا

تھا۔ اس کے بعد مہاراجہ کی خدمت میں پھل اور پھول پیش کئے گئے جن کا رنگ زرد تھا۔ بعد ازیں اُمراء، وزراء افسران آئے جنھوں نے زرد لباس پہن رکھے تھے، انہوں نے نذریں پیش کیں۔ اس کے بعد طوائفوں کے مجرے ہوئے، مہاراجہ نے دل کھول کر اِنعامات دیئے" (نقوش، لاہور نمبر ص ۷۶۳)

انگریز موٴرخ الیگزینڈر کا یہ بیان ظاہر کرتا ہے کہ اگرچہ راجہ رنجیت سنگھ کے دور میں بسنت بظاہر بہار کا خیر مقدم کرنے کے لئے منائی جاتی تھی مگر اس کی تقریبات پر مذہبی رنگ غالب تھا۔ مہاراجہ کا میلے میں باقاعدہ گرنتھ صاحب سننا اور گرنتھی کو تحائف دینا مذہبی رسومات کے زمرے میں آتا ہے۔ ہندو برہمنوں کو نذرانے دیتے ہیں تو سکھ گرنتھیوں کو تحائف دیتے ہیں۔ سکھ مذہب میں بسنتی یا زرد رنگ کو بھی ایک خاص تقدس کا مرتبہ حاصل ہے۔ اب بھی سکھ مذہبی راہنما زرد پگڑیاں پہنے نظر آتے ہیں۔

الیگزینڈر نے راجہ رنجیت سنگھ کے دور میں جس بسنت میلہ میں شرکت کی، وہ ۶ فروری کو منعقد کیا گیا۔ ہندو موٴرخین نے حقیقت رائے دھرمی کی سزائے موت پر عملدرآمد کی تاریخ بسنت پنچمی بتائی ہے۔ عین ممکن ہے اس سال بسنت پنچمی اور ۶ فروری کی تاریخیں ایک ہی دن میں واقع ہوئی ہوں۔ لاہور میں ماضی قریب میں بسنت ۶ یا ۷ فروری کو منایا جاتا رہا ہے۔ ان تاریخوں کی مشابہت بھی حقیقت رائے کے میلہ کی بسنت میلے سے نسبت کو ظاہر کرتی ہے۔

الیگزینڈر نے راجہ رنجیت سنگھ کی طرف سے ۶ فروری کو منائے جانے والے میلے کو 'بہار کا خیر مقدم' کہا ہے، جو عقلی اعتبار سے درست نہیں ہے۔ فروری کے پہلے ہفتہ میں اب بھی اچھی خاصی سردی پڑتی ہے، ماضی میں تو موسم کی شدت اور زیادہ تھی۔ موسم بہار کا آغاز فروری کے آخری ہفتے یا مارچ کے پہلے ہفتہ میں ہوتا ہے۔ اگر یہ میلہ بہار کے استقبال میں منعقد کیا جاتا تو اسے سردیوں یا خزاں کے عین درمیان ہرگز منعقد نہ کیا جاتا۔ معلوم ہوتا ہے انگریز موٴرخ جو بسنت میلہ کے حقیقی پس منظر سے واقف نہیں تھا، کو غلط فہمی لاحق ہوئی ہے۔ سکھ دورِ حکومت میں ۶ فروری کو بسنت میلہ منانا ظاہر کرتا ہے کہ یہ سرکاری سطح پر حقیقت رائے کے میلے کا اِنعقاد ہی تھا۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند دیگر ہندو و سکھ مصنّفین کی آراء بھی درج کر دی جائیں جن کے خیال میں لاہور میں بسنت میلہ حقیقت رائے دھرمی کی یاد میں منایا جاتا ہے۔ اورنٹیل کالج، لاہور کے سابق لیکچرر گیانی خزان سنگھ نے "تاریخ گوردوارہ، شہید گنج" میں اس واقعہ کا ذکر بے حد جذباتی انداز میں یوں کیا ہے

:

"تواریخ کے محقق اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ بھائی حقیقت سنگھ جنہیں عام لوگ حقیقت رائے دھرمی کے نام سے یاد کرتے ہیں، امرت دھاری اور تیار بر تیار سنگھ تھے۔ آپ کے ننھیال والے سکھ تھے اور موضع سوہدرہ، ضلع گوجرانوالہ میں رہتے تھے۔ آپ کے ماموں بھائی ارجن سنگھ تیار بر تیار سنگھ تھے جو کہ آپ کے ساتھ ہی نخاس چوک میں شہید کر دیئے گئے تھے۔ آپ کے سسرال بھائی کنشن سنگھ وڈالے والہ کے گھر تھے۔لاہور میں اس جگہ (شہید گنج) پر آپ کو سزائے موت کا حکم سنایا گیا۔ ان کے بوڑھے پتا، ضعیف والدہ اور جوان بیوی کی آہیں اور فریادیں، پتھروں کو بھی موم کر دینے والی چیخیں اور منتیں بھی اس وقت کے حکام کے دل میں رحم اور ترس کے جذبات پیدا نہ کر سکیں اور آپ نہایت سکون کے ساتھ سن ۱۸۰۳ء بکرمی میں پنچمی کے دن دھرم کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھ گئے۔بسنت پنچمی کے روز آپ کی سمادھ پر بڑا بھاری میلہ لگتا ہے"

گیانی خزان سنگھ کی 'تحقیق' کے مطابق حقیقت رائے ہندو نہیں بلکہ 'سکھ' تھا۔ مندرجہ بالا سطور میں جن بے پایاں عقیدت کا اظہار کیا گیا ہے، اس سے یہ گمان گزرتا ہے کہ ہندو اور سکھ، مسلمانوں کے پیغمبر کے گستاخ حقیقت رائے کو وہی درجہ دیتے ہیں، جو مسلمان غازی علم الدین شہید کو دیتے ہیں۔ سکھوں کی طرف سے 'بسنت میلہ' میں جوش وخروش کے اِظہار کی شاید ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ حقیقت رائے کو سکھ سمجھتے ہیں۔

ڈاکٹر سر گوکل چند نارنگ تقسیم ہند سے قبل حکومتِ پنجاب میں لوکل گورنمنٹ کے وزیر تھے۔ وہ اپنی انگریزی تصنیف "ٹرانسفرمیشن آف سکھ ازم" میں بسنت میلے کا پس منظر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"... فیصلہ سنا دیا گیا اور فوراً ہی لاہور کے عین مرکز میں تمام ہندو آبادی کی آہوں اور بد دعاؤں میں شریف لڑکے کا سر قلم کر دیا گیا۔ اس کی کریا کرم میں سب امیر وغریب شامل ہوئے اور اس کی راکھ لاہور کے مشرق میں چار میل دور دَبا دی گئی، جہاں اس کی یادگار ابھی تک قائم ہے جس پر ہر سال بسنت پنچمی کے روز جو اس کی شہادت کا دن ہے، میلہ لگتا ہے۔"

حقیقت رائے کی یادگار اس وقت کوٹ خواجہ سعید لاہور میں ہے۔ عام طور پر لوگ اس جگہ کو 'باوے دی مڑھی' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ہندی زبان میں 'مڑھی' قبرستان کو کہا جاتا ہے، گویا یہ "بابے کا قبرستان" ہے۔ حقیقت رائے کو ہندوؤں نے 'بابے' کا مرتبہ بھی دے رکھا ہے۔ ایک گستاخِ رسول ان کے نزدیک مقدس 'بابا' ہے۔ موٴرخین کے مطابق حقیقت رائے کی یادگار پر سب سے پہلے جس ہندو رئیس نے میلے کا آغاز کیا تھا، اس کا نام کالو رام ہے۔ یہ یادگار قبرستان کے ساتھ اب بھی موجود ہے!

سیکولرلادین اور مغرب زدہ طبقہ تو ایک طرف رہا، بظاہر مذہب سے لگاؤ رکھنے والے اَفراد کو بھی بسنت منانے سے روکا جاتا ہے تو وہ اسے محض 'ملا کا وعظ' کہتے ہوئے مسترد کر دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں پاکستان میں مذہبی پارساؤں کا ایک عوام دشمن گروہ ہے جو لوگوں کو سچی، حقیقی اور بے ضرر تفریح کے مواقع سے بھی محروم کرنا چاہتا ہے۔ وہ اس بات کو ذہنی طور پر تسلیم کرنے کو تیار ہی نہیں ہیں کہ بسنت ہندوؤں کا ایک مذہبی تہوار بھی ہے جو اسے خاص موسم میں مناتے ہیں۔ حقیقت رائے کی یاد میں منائے جانے والے 'بسنت میلہ' کے پس منظر سے تو شاید ہی کوئی واقف ہو۔ ہندو اور سکھ مؤرخین برملا اعتراف کرتے ہیں کہ لاہور میں بسنت پنچمی کے روز منایا جانے والا میلہ حقیقت رائے کی یاد میں منایا جاتا ہے۔ مگر ہمارے بعض مسلمان بضد ہیں کہ یہ صرف موسمی تہوار ہے۔

بعض افراد یوں استدلال کرتے ہیں کہ بسنت ہندوؤں کا مذہبی تہوار ہو گا مگر ہم تو اسے محض موسمی اور ثقافتی تہوار سمجھ کر مناتے ہیں۔ یہ تو ان کا محض تجاہل عارفانہ ہے۔ ایک شخص دعوت ناؤنوش میں شریک ہوتا ہے، وہاں حلال اور حرام مشروبات کثیر تعداد میں موجود ہیں، اس نے شراب کو آج تک دیکھا ہے، نہ چکھا ہے۔ وہ شراب کی بوتل کھول کر کچھ نوشِ جاں کر لیتا ہے۔ اتنے میں مجلس میں موجود اسے ایک شخص بتاتا ہے کہ قبلہ آپ شراب سے لطف اندوز ہو رہے ہیں؟ اس اطلاع کے بعد بھی اگر وہ یہ عذر پیش کریں کہ میں تو اس کو محض ایک شربت سمجھ کر پی رہا ہوں تو کیا اس کا یہ عذر معقول سمجھا جائے گا؟ مزید برآں بسنت کے تاریخی پس منظر سے لاعلمی کا اظہار بھی کوئی معقول وجہ نہیں ہے۔ ایک جاہل آدمی تو شاید معذور ہو مگر وہ لوگ جو یونیورسٹیوں سے فارغ التحصیل ہیں اور غرورِ علم میں مبتلا ہیں وہ لاعلمی کا عذر پیش کر کے اس ذمہ داری سے پہلو کیسے بچا سکتے ہیں؟ قانون سے لاعلمی کو سزا سے بریت کا جواز تسلیم نہیں کیا جاتا تو ان عالم فاضل اَفراد کی طرف سے بسنت کے بارے میں اس تجاہل عارفانہ کو کیسے قبول کیا جا سکتا ہے۔

لاہور شروع سے بسنت کا مرکز رہا ہے، مگر چند برسوں سے جس رنگ میں یہاں بسنت منایا جاتا رہا ہے، اس کی مثال نہیں ملتی۔ محمد حنیف قریشی صاحب اپنے مضمون میں ''بسنت کا تہوار، تاریخ و مذہب کے آئینہ میں'' لاہور میں بسنت کے تہوار کے بارے میں موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہ بات اکثر کہی جاتی ہے کہ بسنت ایک موسمی اور ثقافتی تہوار ہے، جس کا مذہب اور قوم سے کوئی تعلق نہیں تاہم ابھی ایسے بزرگ ہزاروں کی تعداد میں موجود ہوں گے جو اس امر کی شہادت دیں گے کہ آزادی سے قبل بسنت کو عام طور پر ہندوؤں کا تہوار ہی سمجھا جاتا تھا اور لاہور میں ہی جوش و خروش سے منایا جاتا تھا۔ جہاں دو تین جگہ بسنت میلہ منعقد ہوتا تھا، ہندو مرد اور عورتیں باغبانپورہ لاہور کے قریب حقیقت رائے کی سمادھ پر حاضری دیتے اور وہیں میلہ لگاتے۔ مرد زرد رنگ کی پگڑیاں باندھے ہوتے اور عورتیں اسی رنگ کا لباس ساڑھی وغیرہ پہنتیں۔ سکھ مرد اور عورتیں اس کے علاوہ گوردوارہ اور

گورومانگٹ پہ بھی میلہ لگاتے۔ ہر جگہ خوب پتنگ بازی ہوتی۔ اندرون شہر بھی پتنگیں اُڑائی جاتیں اور لاکھوں روپیہ اس تفریح پر خرچ کیا جاتا۔ مسلمان بھی اس میں حصہ لیتے مگر زرد کپڑوں وغیرہ کے استعمال سے گریز کرتے۔ یہ سارا کھیل دن کو ہوتا، رات کو روشنیاں لگانے اور لاؤڈ سپیکر، آتش بازی یا اسلحہ کے استعمال کا رواج نہ تھا" (نقوش، لاہور نمبر)

مذہبی لحاظ سے تو بسنت منانا قابل اعتراض ہے ہی، خالصتاً موسمی اور ثقافتی تہوار کی حیثیت سے بھی اس کی حمایت نہیں کی جاسکتی۔ گذشتہ چند برسوں سے لاہور کے نودولیتوں، اَوباشوں، سمگلروں اور عیاشوں نے بسنت کے تہوار کو اپنی اباحیتِ مطلقہ کے اِظہار کا ذریعہ بنا لیا ہے۔ ایک بظاہر سماجی تہوار میں جس طرح سماجی اَخلاقیات کی دھجیاں اُڑائی جاتی ہیں، وہ ہر اعتبار سے قابل مذمت ہے۔ شاید ہی کوئی دوسرا ثقافتی تہوار ہو جس میں اس قدر وسیع پیمانے پر شراب و کباب اور شباب کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اخبارات میں فائیو سٹار ہوٹلوں، حویلیوں اور بعض کوٹھیوں میں بسنت منانے والے خواتین و حضرات کی تصاویر عام شائع ہوتی ہیں، مگر ان مواقع پر رقص و سرود، شراب نوشی اور طوائف بازی کی بے باکانہ گناہ آلود مجالس کا ذکر نہیں کیا جاتا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہوتی ہے کہ ایسی مجالس میں منتخب افراد کو مدعو کیا جاتا ہے، دوسری یہ کہ ان مجالس کے شرکا اس کی تفصیلات ہر صحافی کو کم ہی بتاتے ہیں۔ حتیٰ کہ صحافی حضرات کو بھی ان مجالس میں اس شرط پر شریک کیا جاتا ہے کہ وہ رازداری قائم رکھیں گے۔ ان مجالس میں ثقافت کے نام پر جو جنسی ذلالتیں اور ہوسناکیاں برپا کی جاتی ہیں، انہیں منظر عام پر اگر لایا جاسکے تو قوم کو معلوم ہو گا کہ ایک اسلامی ریاست میں فحاشی کی کون کون صورتیں طبقہ اُمرا میں مروّج ہیں۔

راقم الحروف کے ایک جاننے والے صاحب ہیں جنہیں ایسی مجالس میں شریک ہونے کا موقع ملا ہے۔ ان کی روایت کے مطابق بسنت کے موقع پر لاہور شہر کی معروف طوائفوں اور اداکاراؤں کی بولیاں لگتی ہیں۔ ان کے بقول گذشتہ سال (۲۰۰۰ء) بسنت کے موقع پر ایک نوخیز فلمی اداکارہ کو گلبرگ کے ایک رئیس صنعت کار نے بسنت رات کے لئے پانچ لاکھ دے کر 'بک' کیا۔ اس اداکارہ نے تمام رات فطری لباس میں یعنی عریاں ہو کر رقص پیش کیا۔ فسق و فجور کی اس مجلس میں لاہور کے منتخب اَشراف شریک تھے، انہوں نے جس والہانہ انداز میں ویلیں نچھاور کیں، اس کا اندازہ خود راوی کو بھی نہیں ہے۔ جنسی باؤلے پن اور حیوانیت کے جو مظاہرے کئے گئے، ان کا الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں ہے۔ انہی صاحب نے شاہ جمال کی ایک کوٹھی میں بسنت کے اِنتظامات کا آنکھوں دیکھا حال بیان کرتے ہوئے بتایا کہ کوٹھی کے ایک حصے میں شراب کا کاؤنٹر سجایا گیا تھا جہاں نہایت قیمتی شراب، انواع قسم وافر مقدار میں موجود تھی۔ ہر طالب حسبِ خواہش شراب نوشی کر سکتا تھا۔ کوٹھی کے لان میں باربی کیو کا اہتمام تھا جہاں لذتِ کام و دہن کے لئے ہر نعمت موجود تھی۔ ایک وسیع ہال میں رقص و سرود کی محفل جمع تھی۔ مکان کی چھت پر ڈھول تماشے، طوائفیں اور کرائے کی عورتیں موجود تھیں جو ہر 'بوکاٹا' پر نعرے لگاتی تھیں۔

رات کے آخری حصے میں طوائفیں بدستور رقص پیش کر رہی تھیں، البتہ شرکا کی اکثریت شراب کے نشے میں مدہوش تھی... دو چار کوٹھیوں کی بات نہیں ہے، بسنت کے موقع پر لاہور شہر میں سینکڑوں ایسے محلات ہیں جہاں اباحیتِ مطلقہ اور جنسی ہوسناکیوں کے یہ مناظر دیکھے جاسکتے ہیں۔ ان مجالس میں محض امرا ہی نہیں، وہ لوگ بھی شریک ہوتے ہیں جن کا بنیادی فریضہ امن عامہ کا قیام اور جرائم پیشہ افراد کی گرفتاری ہے۔

رنجیت سنگھ کے زمانے میں طوائفیں بسنت میلے میں شریک ہوتی تھیں اور بسنتی لباس پہنتیتھیں، آج بھی 'گناہ کے بازار' میں بسنت کا تہوار بے حد جوش و خروش سے منایا جاتا ہے۔ پرانے زمانے میں اُمراء کی بیگمات زرد لباس نہیں پہنتی تھیں مگر آج امیر گھرانوں کی بیگمات طوائفوں کے اتباع میں نہ صرف زرد لباس پہنتی ہیں بلکہ پتنگ بازی میں جوش و خروش سے حصہ لیتی ہیں۔ نوجوان لڑکیاں بوکاٹا کے نعرے لگاتی اور کلاشنکوف سے فائرنگ کرتی ہیں۔ اندرونِ شہر مکانوں کی چھتیں سرسوں کے کھیت جیسا منظر پیش کرتی ہیں۔

بسنت ایک ایسا تہوار ہے جس میں امیر، متوسط اور غریب گھرانے اپنی اپنی مالی اِستعداد کے مطابق حصہ لیتے ہیں۔ فروری کا مہینہ شروع ہوتے ہی بسنت کی تیاریاں شروع ہو جاتی ہیں۔ پتنگ بازی جہاں ایک بہت بڑا شغل سمجھا جاتا ہے، وہاں پتنگ سازی لاہور میں اچھی خاصی صنعت کا روپ دھار چکی ہے، ایک فضول شوق کی تکمیل میں قوم کا کروڑوں روپے کا سرمایہ برباد کر دیا جاتا ہے۔ وہ لوگ جو مالی پریشانیوں سے دوچار ہیں اور زندگی کی گاڑی مشکل سے چلا رہے ہیں، وہ بھی چاہے قرض کیوں نہ لینا پڑے، بسنت ضرور مناتے ہیں۔ ایک جنون ہے جو اہل لاہور پر طاری ہو جاتا ہے یا کر دیا جاتا ہے، دو چار روپے کی پتنگ لوٹنے کے لئے لڑکے بالے ہاتھوں میں ڈھانگے لئے سڑکوں پر دیوانہ وار پھرتے ہیں، انہیں تیز رفتار ٹریفک کا احساس ہوتا ہے، نہ انہیں مکانات کی چھتوں سے گرنے کا احتمال روکتا ہے۔ کٹی ہوئی پتنگ دیکھتے ہی ان پر دیوانگی اور پاگل پن طاری ہو جاتا ہے۔ گذشتہ سال ہمارے مکان کے بالکل سامنے ایک درخت پر اَٹکی ہوئی پتنگ کو اُتارتے ہوئے ایک دس سالہ بچہ شاخ ٹوٹنے کی وجہ سے زمین پر گر پڑا۔ ابھی چند روز پہلے ایک معاصر روزنامے میں ایک بچے کی تصویر شائع ہوئی جس کے دونوں بازو گذشتہ سال بسنت کے موقع پر کاٹنے پڑے۔ تیز دھار ڈور کی وجہ سے کئی مرتبہ راہ گیروں کی گردنیں کٹ جاتی ہیں۔ مکانوں سے گر کر ہلاک ہونے والوں کی تعداد خاصی تشویش ناک ہے۔

آج کل بسنت کا تہوار محض پتنگ بازی تک محدود نہیں رہا، اس میں آتشیں خودکار اسلحہ سے فائرنگ کا خطرناک رُجحان بھی فروغ پاچکا ہے۔ بسنت کی رات پورا شہر کان پھاڑنے والی فائرنگ کی زد میں رہتا ہے۔ کوئی اگر مریض ہے اور شور سے پریشان ہوتا ہے، تو جانے اپنی بلا سے، بسنت بازوں کو اس کی کچھ پرواہ نہیں ہے۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے کسی دشمن ملک نے لاہور پر چڑھائی کر دی ہے، ایک دھماکوں کا سلسلہ ہے جو طلوعِ سحر تک جاری رہتا ہے۔ فائرنگ کے ساتھ ڈیک

لگا کر اونچی آواز میں موسیقی کے نام پر طوفانِ بدتمیزی برپا کیا جاتا ہے۔ پتنگ کٹنے یا کاٹنے پر لڑکیاں لڑکے مل کر مجنونانہ اُچھل کود کرتے ہیں۔ چھتوں پر دندناتے ہیں اور بے تحاشا ہڑبونگ مچاتے ہیں۔ اگر کوئی ناسازیٔ طبع کی بنا پر نیچے کمروں میں سویا ہوا ہے، اسے پہنچنے والی ذہنی اذیت کا احساس تک نہیں کیا جاتا۔

لاہور زندہ دلوں کا شہر سمجھا جاتا رہا ہے مگر یہاں کی زندہ دلی اب ہلڑ بازی کا رنگ اختیار کر چکی ہے کسی ثقافتی تہوار میں جس شائستگی اور سماجی نفاست کی توقع کی جاتی ہے، بسنت کے موقع پر اس کے بالکل برعکس مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ لاہور میں شادی بیاہ کے موقع پر تو کھانوں پر ابھی تک پابندی ہے، مگر بسنت کے موقع پر جس اِسراف کے ساتھ گھر گھر کھانوں اور دعوتوں کا اہتمام کیا جاتا ہے، اس کی طرف ابھی تک توجہ نہیں کی گئی۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق اس طرح کی دعوتوں میں مجموعی طور پر کروڑوں روپے اُڑا دیئے جاتے ہیں۔

بسنت کے موقع پر کس قدر جوش و خروش اور جنون خیزی کا مظاہرہ کیوں کیا جاتا ہے؟ اس کی ذمہ داری کسی ایک طبقہ پر نہیں ڈالی جاسکتی۔ حکومت، ذرائع اَبلاغ، پریس، سیکولر طبقہ، والدین، اساتذہ، سماجی راہنما، طبقہ علما سب نے اس معاملے میں کوتاہی کا ارتکاب کیا ہے۔ ہمیں اعتراف کرنا چاہئے کہ ہم نے نوجوان نسل کی تعلیم و تربیت اور راہنمائی کے فرائض کو اَحسن طریقے سے نبھانے میں غفلت کا مظاہرہ کیا ہے۔ ماضی قریب میں پتنگ بازی کو آبرومندانہ شغل یا تفریح نہیں سمجھا جاتا تھا۔ صدر ضیاء الحق مرحوم کے دور تک ہر سال بسنت کے موقع پر حکومت پنجاب کی طرف سے تمام اِداروں کے سربراہوں کو ہدایت کی جاتی تھی کہ وہ اپنے دفتر کے افسروں کو پتنگ بازی یا ہلڑ بازی میں شریک ہونے سے منع کریں۔ پتنگ بازی کو سرکاری قواعد میں وقار سے گری ہوئی تفریح سمجھا جاتا تھا۔ سن ۲۰۰۰ء میں پہلی مرتبہ لاہور میں بسنت کا تہوار سرکاری سرپرستی میں منایا گیا، پتنگ بازی کے باقاعدہ مقابلے کرائے گئے اور جیتنے والوں کو انعام واِکرام سے نوازا گیا۔ لاہور کارپوریشن اور ہارٹی کلچرل اتھارٹی نے مال روڈ اور دیگر اہم شاہراہوں پر پتنگ نما کتبے آویزاں کئے جو کئی ماہ تک یونہی لگے رہے۔ حکومت ناجائز اسلحہ کی پکڑ دھکڑ کے بارہا اعلانات کرتی رہتی ہے، مگر بسنت کے موقع پر بے تحاشا فائرنگ کرنے والوں کو گرفتار نہیں کیا جاتا۔ دھات کی ڈوروں کے استعمال کی وجہ سے واپڈا کا بجلی سپلائی کرنے کا نظام شدید متاثر ہوتا ہے، مگر اس جرم کے مرتکب افراد کے خلاف قانونی کاروائی نہیں کی جاتی۔ واپڈا کی اپیلیں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں، اسے ہر سال کروڑوں روپے کا نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے۔

بسنت جیسے تہوار کے متعلق جنون خیزی پیدا کرنے میں سب سے زیادہ کردار ذرائع ابلاغ پر چھائے ہوئے ایک مخصوص طبقہ نے ادا کیا ہے جو تہذیب و ثقافت کے نام پر اس ملک میں بیہودگی اور اباحیت کو رواج دینا چاہتا ہے۔ بسنت کے موقع پر ٹیلی ویژن پر 'پتنگ باز سجنا' جیسے واہیات گانوں کو بار بار پیش کیا

جاتا ہے، اخبارات میں خصوصی ایڈیشن شائع کئے جاتے ہیں جس میں بازاری عورتوں کو بسنتی لباس میں دکھایا جاتا ہے۔اَخباری رپورٹوں میں بار بار بسنت کے اِنتظامات کا تذکرہ کیا جاتا ہے اور اِعلانات شائع کئے جاتے ہیں کہ فلاں فلاں مقامات پر بسنت انتہائی جوش و خروش سے منایا جائے گا۔ یہ ساری سرگرمیاں نوجوانوں میں بسنت کے متعلق آتش شوق کو بھڑکا دیتی ہیں۔

سکولوں میں اساتذہ بچوں میں بسنت کے متعلق صحیح شعور پیدا کرنے کی بجائے اُلٹا انہیں ان تقریبات میں والہانہ طور پر شریک ہونے کے لئے اکساتے ہیں۔ کلاس میں پوچھا جاتا ہے کہ "بچو! اس سال بسنت منانے کے لئے آپ نے کیا کیا انتظام کیا ہے؟" اساتذہ کی اپنی معلومات بھی بے حد ناقص ہیں، وہ اسے محض موسمی تہوار ہی سمجھتے ہیں۔ انگلش میڈیم سکولوں میں بے حد اہتمام سے بسنت منایا جاتا ہے۔ طلباء و طالبات مل کر گڈیاں اور گڈے اُڑاتے ہیں۔ ایسی مخلوط مجالس جنسی ہیجان خیزی اور آوارگی کو پروان چڑھاتی ہیں۔ کارپوریشن اور حکومت کی زیر نگرانی چلنے والے سکولوں میں بھی بقدرِ استعداد اس غیر اسلامی تہوار کا جشن برپا کیا جاتا ہے۔

ایک اسلامی مزاج رکھنے والی خاتون، جس کے بچے ڈویژنل پبلک سکول میں پڑھتے ہیں، نے بتایا کہ سکول کے پرنسپل نے سخت ہدایات جاری کی ہیں کہ بسنت کے موقع پر ہر طالب علم کم از کم ایک 'گڈی' کا بندوبست ضرور کر کے آئے اور ہر طالبہ کے لئے ضروری قرار دیا گیا ہے کہ وہ ایک ڈور خرید کر لائے۔ نہایت تاسف کا مقام ہے کہ ہمارے سکول جہاں توقع کی جاتی ہے کہ طلباء میں اسلامی شعائر سے محبت کو پروان چڑھائیں گے، وہاں ہندوؤں کے تہوار منانے کو لازمی قرار دیا جاتا ہے۔ کیا مسلمانوں کے اپنے تہوار منانے کے لئے بھی سکولوں میں اس قدر تہذیبی جوش و خروش کا مظاہرہ کیا جاتا ہے؟ اس کا جواب والدین کو بخوبی ہے۔ اس بارے میں والدین کو بھی بری الذمہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ جب بچے والدین کا جوش و خروش دیکھتے ہیں تو اس کا گہرا اثر قبول کرتے ہیں۔ بعض افراد کو دیکھا گیا ہے کہ وہ بچوں کے ساتھ مل کر پتنگ لوٹنے میں مصروف ہوتے ہیں۔

ہمارے لئے لمحہ فکریہ ہے کہ ہم ٹھنڈے دل سے غور کریں کہ کہیں ہم شعوری یا غیر شعوری طور پر ایک گستاخِ رسول کی یاد میں منعقد کئے جانے والے بسنت میلہ میں شریک ہو کر توہین رسالت کا ارتکاب تو نہیں کر رہے؟ کیا ہم ہندوؤں کے مذہبی تہوار کو منا کر دوسری قوموں سے مشابہت کے گناہ کا اِرتکاب تو نہیں کر رہے؟ کیا ہمارا بسنت منانے کا طور طریقہ لہو و لعب کی تعریف میں شامل تو نہیں ہے؟ اہل اقتدار کو بھی ضرور سوچنا چاہئے کہ وہ بسنت جیسے تہواروں کی سرپرستی کر کے کہیں مسلمانوں کے اصل تہواروں کے متعلق عام لوگوں میں عدمِ دلچسپی کے جذبات کو تو پروان نہیں چڑھا رہے؟ بسنت کے نام پر رقص

وسرور، ہلڑ بازی، ہاؤہو، شور شرابہ، چیخم دھاڑ، فائرنگ، وغیرہ مہذب قوموں کا شعار نہیں ہے۔ ہمیں رسالت مآب کا یہ فرمان بھی پیش نظر رکھنا چاہئے۔ آپ نے فرمایا:

" تمام قوموں کی عیدیں ہیں، ہماری عیدیں عیدالفطر اور عیدالاضحی ہیں!"

اسی طرح نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

"جو کسی قوم سے مشابہت کرے گا وہ انہی میں اٹھایا جائے گا" (ابوداود)